اسلامی انتہا پسندی کا نظریاتی سراب

حسن جعفر زیدی

ادارہ مطالعہ تاریخ

اسلامی انتہا پسندی کا نظریاتی سراب

حسن جعفر زیدی

ادارہ مطالعہ تاریخ۔ لاہور

اس کتاب کے کسی بھی حصے کی شکل میں دوبارہ اشاعت کی اجازت نہیں ہے۔ باقاعدہ قانونی معاہدے کے تحت جملہ حقوق بحق مرتبین محفوظ ہیں۔ کتاب کا کسی بھی زبان میں ترجمہ کرنے کے لیے مصنف سے قبل ازیں اجازت ضروری ہے۔

بصورت دیگر مصنف قانونی چارہ جوئی کا حق محفوظ رکھتا ہے۔

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

ناشر: ادارہ مطالعہ تاریخ، لاہور

مطبع: اے۔ایم۔انٹر پرائزز۔ رائل پارک، لاہور

سال اشاعت: 2012ء

کمپوزنگ: عامر شاہ

پروف ریڈنگ: سعید قریشی

قیمت: -/110 روپے

ملنے کا پتہ

66 - H / 2، واپڈا ٹاؤن، لاہور

فون: 0092-42-35224247, 0092-42-35182835

فیکس: 0092-42-35183166 E-mail: hjzaidi@gmail.com

Website: www.tehqeeq.org

فہرست

1۔	پیش لفظ	4
2۔	اسلامی انتہاپسندی کا نظریاتی سراب	7
3۔	حواشی	59
4۔	آراء	61
	☆ حمید اختر	
	☆ خالد احمد	
	☆ مسعود اشعر	
5۔	قیام پاکستان کی بنیاد، نظریاتی یا جدلیاتی	69
6۔	ضیاء الحق کے مارشل لاء کا تاریخی پس منظر	101

پیش لفظ

ملک اس وقت خانہ جنگی کے دور میں ہے۔ اپنے اور بے گانے سب ہی کھلے الفاظ میں پاکستان کے وجود، سالمیت اور مستقبل کے بارے میں بدگمانی کا اظہار کررہے ہیں۔ لوگ پریشان ہیں۔ ایک طرف طالبان اور دیگر مذہبی انتہاپسندوں نے ملک کے شمال مغرب میں ایک وسیع علاقے سے حکومت کے اختیار کو تقریباً ختم کردیا ہے تو دوسری جانب امریکہ ڈرون اڑانوں اور میزائل حملوں کے ذریعہ سے حکومت پاکستان کی حاکمیت اور اختیار کی عملاً نفی کررہا ہے۔

9/11 کے بعد سے دہشت گردی کے خلاف جنگ کے حوالے سے امریکہ نے دہشت گردی کا آغاز کررکھا ہے۔ اس کے لیے وہ القاعدہ اور طالبان کی دہشت گرد کاروائیوں کو بطور جواز پیش کرتا ہے۔ طالبان امریکہ کے مخالف اور امریکہ طالبان مخالف نظر آتا ہے۔ لیکن طالبان کی کارروائیوں سے امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو ہی فائدہ پہنچ رہا ہے۔ افغانستان اور عراق میں امریکی افواج موجود ہیں۔ ایک عجیب طرح کا ذہنی انتشار پھیلا ہوا ہے۔ کچھ لوگ امریکہ اور طالبان کو ایک ہی سکے کے دو رخ قرار دے رہے ہیں جبکہ کچھ اور کے خیال میں یہ تہذیبوں کے درمیان ٹکراؤ ہے۔ ہر دوصورتوں میں تیل اور گیس کے ذخائر پر امریکی تسلط کی راہ ہموار کی جارہی ہے۔

دوسری عالمگیر جنگ کے دوران امریکی سامراج نے سوویت یونین کا مقابلہ کرنے کے لیے جو پالیسی اختیار کی اس کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ تیسری دنیا کو پسماندہ رکھنے کے لیے وہاں مذہبی انتہاپسندی کو ہوا دی جائے۔

ادارہ مطالعہ تاریخ نے 12 جلدوں پر مشتمل پاکستان کی سیاسی تاریخ کی گیارہویں جلد ''ترقی اور جمہوریت کا راستہ روکنے کے لیے اسلامی نظام کے نعرے، ملائیت اور فرقہ واریت کا آغاز'' اور بارہویں جلد ''اتحاد عالم اسلام اور اسلامی بلاک کے نام پر ابتدا

ہی میں پاکستان امریکہ کا غلام کیسے بنا'' شائع کی ہیں جن میں اس دور کی صورت احوال کا احاطہ کیا گیا ہے۔

جب سوویت یونین نے افغانستان میں اپنی افواج داخل کیں اور وہ اس علاقے میں اینگلو امریکی سامراج کے مفادات کے لیے خطرہ بن گیا تو اس نے دنیا بھر سے مسلمان انتہاپسندوں کو بھرتی کیا انہیں جہادیوں کا نام دیا اور انہیں منظم و مسلح کیا۔ سوویت یونین کے زوال کے بعد یہی جہادی دہشت گرد قرار پائے اور ان کے خلاف جنگ کرنے کی خاطر پوری دنیا کو میدان جنگ قرار دے دیا۔

9/11 کے فوراً بعد امریکہ اور مغرب نے پینترا بدلا۔ ادارۂ مطالعہ تاریخ نے ''پاکستان میں مذہبی انتہاپسندی آغاز، فروغ اور اثرات'' کے عنوان سے لاہور میں ایک سیمینار کا اہتمام کیا۔ پھر 2004ء میں ''ہماری تاریخ: بنیادی غلط فہمیاں اور آج کے تقاضے'' کے عنوان سے لاہور میں ایک اور سیمینار منعقد کیا جس میں حسن جعفر زیدی نے اسی موضوع پر مقالہ پیش کیا جس پر خالد احمد، حمید اختر اور مسعود اشعر نے سیر حاصل تبصرہ کیا۔ 2009ء کے آغاز میں حلقہ ارباب ذوق لاہور میں اس مضمون کو تنقید کے لیے پیش کیا گیا اور فروری 2009ء میں ''ادب لطیف'' میں یہ مضمون شائع ہوا۔ حمید اختر صاحب نے روزنامہ ایکسپریس میں مضمون کے بارے میں دو کالم لکھے۔ ادب لطیف میں مضمون کی اشاعت اور حمید اختر کے کالموں کے بعد علمی اور ادبی حلقوں میں اس مضمون پر گفتگو شروع ہوگئی۔ 20/مارچ 2009ء کو ادب لطیف نے اسی مضمون کے حوالے سے ایک خصوصی نشست کا اہتمام کیا جس میں قاضی جاوید، ڈاکٹر مبارک علی، حسین نقی، حمید اختر، محمود گیلانی، امجد طفیل اور ضیاء الحسن نے اظہار خیال کیا۔ اس مضمون کی اس قدر پذیرائی ہوئی کہ اسے مع آراء و حواشی مئی 2009ء میں ایک کتابچہ بعنوان ''اسلامی انتہا پسندی کا نظریاتی سراب'' شائع کر دیا گیا۔ اسے پاکستان اور بیرون ملک متعدد رسائل و اخبارات شائع کر چکے ہیں۔

انتہا پسندی کے جس نظریاتی سراب کو پاکستان میں ہوا دی گئی ہے اس میں یہ

تصور بھی شامل ہے کہ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے اور اس کی نظریاتی سرحدیں جغرافیائی سرحدوں سے زیادہ اہم ہیں۔ اس حوالے سے حسن جعفر زیدی نے ایک خیال افروز مضمون 16 راگست 2009ء کو حلقہ ارباب ذوق لاہور کے خصوصی اجلاس بہ سلسلہ یوم آزادی پیش کیا جس کا عنوان تھا ''قیام پاکستان۔نظریاتی یا جدلیاتی''۔ یہ مضمون برطانیہ اور پاکستان کے کئی رسالوں اور اخباروں میں شائع ہو چکا ہے اور اس کی بھی احباب میں بہت مانگ ہے۔

''ضیاء الحق کے مارشل لاء کا تاریخی پس منظر'' کے عنوان سے حسن نے ایک مضمون 3 جولائی 2011ء کو حلقہ ارباب ذوق لاہور کے ضیاء مارشل لاء کے تاریک دور کے آغاز کے حوالے سے منعقدہ خصوصی اجلاس میں پیش کیا جس میں بتایا گیا ہے کہ پاکستان کے حکمرانوں کو انتہا پسندی کے سراب کو فروغ دینے کی کیا ضرورت تھی۔

احباب کی جانب سے مسلسل اصرار اور ملکی حالات کے پیش نظر ''اسلامی انتہا پسندی کا نظریاتی سراب'' کا نیا ایڈیشن شائع کیا جا رہا ہے جس میں مذکورہ تینوں مضامین شامل کر دیئے گئے ہیں۔ ہمیں امید ہے اس نئے ایڈیشن کو بھی پہلے کی طرح آپ کی جانب سے پذیرائی حاصل ہوگی۔

25 اپریل 2012ء

خالد محبوب

ادارہ مطالعہ تاریخ۔لاہور

اسلامی انتہا پسندی کا نظریاتی سراب

حسن جعفر زیدی
hjzaidi@gmail.com

آج کل ہم شدید فکری اور نظریاتی انتشار کا شکار ہیں۔ ایک جانب امریکہ اپنا سامراجی ایجنڈا لے کر ہمارے ملک پر چڑھ دوڑا ہے تو دوسری طرف طالبان اور خودکش حملہ آور اسلام کے نام پر بھیانک ترین وحشت و بربریت کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ عام آدمی پریشان ہے، وہ امریکہ کے بھی خلاف ہے اور طالبان کے بھی۔ کیونکہ یہ دونوں ہی عملاً پاکستان اور یہاں کے عوام کے خیر خواہ نہیں ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ اس شدید ذہنی خلفشار اور کنفیوژن میں عام آدمی بھی اسلامی انتہا پسندی کی دلدل میں پھنستا جا رہا ہے۔ یعنی ذہنی طالبانائزیشن کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ ملک اسلام کے نام پر بنا تھا اسلئے یہاں اسلامی نظام نافذ ہونا چاہئے۔ اور پھر یہ دلیل جا کر ختم ہوتی ہے طالبانائزیشن پر خواہ وہ ذہنی ہو یا عملی۔ دراصل اس کی بنیاد میں ایک اہم سوال یہ ہے کہ ریاستی نظام کا دین یا مذہب سے کیا تعلق ہے؟ اسلامی انتہا پسندی یا طالبانائزیشن سے ہمدردی رکھنے والے عناصر دین اور ریاست کو یکجا سمجھتے ہیں۔ اس ضمن میں اقبال کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔ ع

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اس فکری اور سیاسی بحران کی بنیاد میں چند اہم تاریخی مغالطے ہیں جن کا گہرا تعلق ہماری تاریخ فہمی کے ساتھ جڑا ہوا ہے اور ان کے بارے میں ہمارے پڑھے لکھے افراد کی اکثریت بھی کنفیوژن کا شکار ہے۔ یہ اہم تاریخی مغالطے ان مفروضوں پر مبنی ہیں:

1- اگر درخشاں ماضی کے اسلامی نظام حکومت کا احیاء کر دیا جائے تو عوام کو درپیش تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔

2- اگر دنیا کے تمام مسلمان، درخشاں ماضی جیسے اسلامی اتحاد و اخوت اور بھائی چارہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے متحد ہو جائیں تو عالم اسلام کے تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔

3- اگر ''جہاد'' کیا جائے تو کفار کا خاتمہ اور دنیا پر مسلمانوں کا غلبہ ہو جائے گا۔

4- دور عروج کے مسلمانوں کا ذاتی کردار بہت اسلامی تھا، وہی کردار اپنانے سے عروج حاصل ہو گا۔

ان مفروضوں کا مسلمانوں کی تاریخ کے تناظر میں گہرا جائزہ لینا بے حد ضروری ہے کیونکہ ان کے بارے میں کنفیوژن کی وجہ سے نہ صرف ہم اس وقت تباہی کے دہانے پر کھڑے ہیں بلکہ ہم نے گزشتہ ڈیڑھ دو سو برس میں بھی بہت شدید نقصانات اٹھائے ہیں جن کا مختصر پس منظر یہ ہے۔

پس منظر

سرد جنگ کے دوران امریکی سامراج نے اسلامی احیاء کی تحریکوں کو اپنے آلہ کار کے طور پر استعمال کیا اور سرد جنگ کے خاتمے کے بعد جب اسے اپنا سامراجی وجود برقرار رکھنے کے لیے ایک مصنوعی دشمن کے خلاف ایک مصنوعی جنگ کھڑی کرنے کی ضرورت پیش آئی تو اس نے انہی تحریکوں کے غبارے میں ہوا بھر کر ان کا ہوّا کھڑا کیا اور دنیا کو بالعموم اور امریکی عوام کو بالخصوص اس سے ڈرایا اور یوں دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر پوری دنیا میں دہشت گردی کا بازار گرم کر دیا۔ تیل اور گیس کے ذخائر سے مالا مال خطوں پر قبضہ کرنے اور 21ویں صدی میں اپنے ممکنہ حریفوں پر غلبے کی پیش بندی کی خاطر اہم سٹریٹیجک مقامات پر اپنی فوجیں اتار دیں۔ سادہ لوح مسلمان پہلے یہ سمجھتے رہے کہ وہ دو سپر طاقتوں میں سے دنیا کی سب سے بڑی جمہوری طاقت امریکہ کا ساتھ دے کر اور سوویت یونین جیسی ''اسلام دشمن'' طاقت کے خلاف جہاد کر کے دنیا کو مسلمانوں کے لیے

ایک محفوظ مقام بنا رہے ہیں۔لیکن حالات نے پلٹا کھایا اور سوویت یونین اپنے مختلف ناحل پذیر داخلی و خارجی تضادات کا شکار ہوکر منتشر ہوگیا۔ گویا دنیا سے ''کفر'' کی سب سے بڑی قوت کا خاتمہ ہوگیا۔

1989ء میں افغانستان سے روسی فوجوں کے انخلاء کے بعد سے لے کر 11رستمبر 2001ء تک کم و بیش 12 سال تک مختلف اسلامی جہادی تنظیمیں کسی کفرواسلام کی جنگ میں نہیں بلکہ ایک دوسرے کے خلاف جہاد کرتی رہیں اور ادھر امریکہ کی بڑی ملٹی نیشنل آئل کمپنیاں اپنے نئے عالمی ایجنڈے کو ترتیب دینے میں مصروف رہیں اور مائیکل مور کی فلم Fahrenheit 9/11 کے مطابق امریکی خفیہ ایجنٹوں کی ناک کے تلے نام نہاد القاعدہ کا نیٹ ورک پروان چڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ 9/11 کا حادثہ رونما ہوا۔ اس کو بنیاد بنا کر امریکی بش انتظامیہ نے War On Terror کے نام سے ایک نئی عالمی جنگ چھیڑ دی اور ''مسلمان'' اور ''اسلام'' کے الفاظ دنیا میں دہشت گردی کی علامت بن کر رہ گئے۔ سامراجی مفادات کی جنگ کو'' تہذیبوں کے ٹکراؤ'' کا نام دے دیا گیا۔ انڈونیشیا سے مراکش تک مسلمان ملک دہشت کا میدان جنگ بنا دیئے گئے۔ بے شمار نوجوان نام نہاد اسلامی جہاد اور نفاذ شریعت کے نام پر جاری جنگ کا ایندھن بن چکے ہیں۔ اور ہزار ہا بے گناہ افراد اس جنگ کا نشانہ بن کر لقمہ اجل بن چکے ہیں۔ایران عراق جنگ میں ایک لاکھ سے زیادہ افرد مارے گئے۔ پھر عراق اور کویت کی جنگ اور عراق و افغانستان پر امریکی حملے اور غاصبانہ قبضے کے بعد لاکھوں لوگ مارے جا چکے ہیں۔

تاریخ کا سنجیدہ طالب علم یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ'' کافر'' سوویت یونین کے زمانے کی دنیا زیادہ پُر امن تھی یا آج کی؟ ۔کار بم دھماکے، خودکش بم دھماکے اور دوسری طرف سے فضائی بمباری، فوجی یلغار، شہری آبادیوں کا قتل عام، عمارتوں کا انہدام، جنگلوں سے پہاڑوں تک، صحراؤں سے دریاؤں اور سمندروں تک آگ اور خون کی ہولی کھیلی جارہی ہے۔ مکہ و مدینہ سے کربلا و نجف تک کے مقدس شہر اس جنگ کی لپیٹ میں آگئے ہیں۔ سرد جنگ کے زمانے میں سوائے فلسطین کے' مسلمان ملکوں کا یہ حال نہ تھا۔ ''کافر''

سوویت یونین کا وجود کسی حد تک مسلمان ملکوں کو امن کی ضمانت مہیا کرتا تھا۔

اسلامی احیاء کی پرتشدد تحریکیں

دوسپر طاقتوں کی سرد جنگ میں امریکہ کے زیرسرپرستی چلنے والی احیائے اسلام کی تحریکوں نے بہت سے سادہ لوح مسلمانوں کو خوب بے وقوف بنایا اور انجام کار شدید نقصان اٹھایا۔ یہ تاریخ میں پہلی بار نہیں ہوا بلکہ کئی بار ہو چکا ہے..... اس کی چند موٹی مثالیں گزشتہ دوڈھائی سو سال کی تاریخ سے واضح طور پر مل جاتی ہیں۔ 19ویں صدی کے اوائل میں جب مسلمان سلطنتوں کا شیرازہ بکھرنے لگا اور ان کے زوال کا عمل تیز ہوا تو مذہبی علماء نے احیائے اسلام کی تحریکیں شروع کیں جو شروع میں علمی مگر بعد میں عسکری رنگ اختیار کر گئیں۔ برصغیر میں شاہ ولی اللہ نے علمی سطح پر اس نوع کی تحریک شروع کی جسے سید احمد شہید بریلوی نے وہابی تحریک کی صورت میں عسکریت کا جامہ پہنا دیا۔ انہوں نے مشرقی بنگال کے مسلمان کسانوں کی انگریز فارم مالکان کے خلاف مسلح جدوجہد کو جسے فرائضی تحریک کہا جاتا تھا، کا رخ موڑ کر پنجاب کی سکھ ریاست کی طرف کر دیا۔ انہوں نے بنگال اور بہار سے مسلمان نوجوانوں کو جہادی تحریک میں بھرتی کیا اور ان کو قریباً ایک ہزار میل دور پشاور کے گردونواح میں پہنچا کر وہاں رنجیت سنگھ کی حکومت کے خلاف جہاد شروع کر دیا۔ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کے مطابق انگریزوں کی بالواسطہ حمایت اس جہاد کو یوں حاصل تھی کہ وہ جہادی جتھے انگریزوں کے زیرانتظام بنگال، بہار، یوپی، سی پی کے علاقوں سے شمال مغربی سرحدی علاقے میں پہنچتے تھے اور انگریزوں کے علم میں ہوتا تھا کہ یہ لوگ کہاں کس مقصد کے لیے جا رہے ہیں۔ ان کے مسلمان ملازم جب ان سے لمبی چھٹی مانگتے تو بقول ہنٹر انہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ کس مقصد کے لیے چھٹی طلب کر رہے ہیں اور ان کی منزل مقصود کہاں ہے۔ (1)

سید احمد بریلوی کی جہادی تحریک کو عارضی کامیابی حاصل ہوئی اور پشاور اور اس کے گردونواح پر کچھ عرصہ کے لیے ان کا قبضہ ہو گیا جو اس وقت رنجیت سنگھ کی حکومت کے ماتحت ہوا کرتا تھا۔ سید احمد نے وہاں طالبان طرز کی شرعی حکومت قائم کی جو وہاں کے قبائلی

رواج سے مطابقت نہ رکھتی تھی چنانچہ یوسف زئ قبیلہ جو وہاں اُن کا سب سے بڑا اتحادی تھا اُن سے منحرف ہوگیا۔[2] ان حالات میں 1831ء میں رنجیت سنگھ کے فرانسیسی جرنیلوں نے بعض قبائلیوں کی مخبری کی مدد سے بالاکوٹ کے مقام پر جہادی لشکر کو گھیرے میں لے کر سید احمد اور سید اسماعیل سمیت سینکڑوں جہادیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور پشاور اور اس کے نواح کے علاقے پر سکھ حکومت کا قبضہ واگزار کرا لیا۔ اس شکست کے بعد جہادیوں کا لشکر تتر بتر ہوگیا اور ہزاروں بنگالی و بہاری نوجوان جو اپنے گھروں سے سینکڑوں میل دور اس جہاد کے لیے آئے تھے یہاں مرکھپ گئے اور بہت کم ایسے تھے جو واپس اپنے گھروں کو جانے میں کامیاب ہو سکے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی کا کہنا ہے کہ ''جس وقت یہ حضرات جہاد کے لئے اُٹھے ہیں اُس وقت یہ بات کسی سے چھُپی ہوئی نہ تھی کہ ہندوستان میں اصلی طاقت سکھوں کی نہیں، انگریزوں کی ہے اور اسلامی انقلاب کی راہ میں سب سے بڑی مخالفت اگر ہوسکتی ہے تو انگریز ہی کی ہوسکتی ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح ان بزرگوں کی نگاہ دور رس سے معاملہ کا یہ پہلو بالکل ہی اوجھل رہ گیا..... بہر حال جب اُن سے یہ چُوک ہوئی تو اس عالم اسباب میں ایسی چُوک کے نتائج سے وہ بچ نہ سکتے تھے''۔[3]

اس جہادی تحریک سے کس کو کتنا فائدہ اور کتنا نقصان پہنچا، اس کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس کا سب سے زیادہ فائدہ انگریزوں کو ہوا۔ مشرقی بنگال کے مسلمان کسانوں کی مسلح تحریک جس سے بنگال میں انگریز فارم مالکان زچ ہو چکے تھے، وہ ماند پڑ گئی کہ اس کا رخ بنگال سے سینکڑوں میل دور شمالی مغربی سرحدی سکھ ریاست کی جانب موڑ دیا گیا۔ انگریز سکھ ریاست کو غیر مستحکم کرنا چاہتے تھے کہ رنجیت سنگھ نے فرانس کے ساتھ اتحاد کر کے فرانسیسی جرنیلوں کو اپنی فوج کی قیادت پر مامور کر دیا تھا۔ دوسرا فائدہ رنجیت سنگھ کو ہوا جس نے پشاور پر اپنا قبضہ بحال کرنے کے بعد وہاں ہری سنگھ نلوا کو گورنر مقرر کیا جو وہاں کا پہلا غیر مسلم گورنر تھا اور اس نے اپنے تین سالہ عہد اقتدار میں عوام الناس پر اس قدر مظالم ڈھائے کہ پٹھان مائیں ہری سنگھ کا نام لے کر اپنے بچوں کو ڈرایا کرتی تھیں۔[4] چنانچہ افغانوں کی سکھ

ریاست سے آزادی کی جدوجہد اور ادھر بنگال میں کسانوں کی انگریز فارم مالکان کے خلاف مسلح جدوجہد دونوں کو نقصان پہنچا۔ اس کے بعد سرسید کی ترقی پسندانہ علی گڑھ تحریک نے مسلمانوں کو دقیانوسی ملاؤں کی راہ سے ہٹا کر جدید تعلیم اور سائنس کے جدید رجحانات کی جانب موڑا تو مسلمانوں میں وہ تعلیم یافتہ طبقہ پیدا ہوا جو جدید مسلم انڈیا اور پھر پاکستان کے قیام پر منتج ہوا۔

اس قسم کی ایک اور جہادی تحریک جس میں سادہ لوح مسلمان اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے اور اپنی مقامی سیاسی جدوجہد کو چھوڑ کر ایک دوردراز علاقے میں اپنی جانوں کا نذرانہ لے کر پہنچ گئے، بیسویں صدی کے اوائل میں تحریک خلافت کے دوران تحریک ہجرت کی شکل میں سامنے آئی۔ جب 10 راگست 1920ء کو سلطان ترکی نے معاہدہ سیورے پر دستخط کردیئے اور شکست خوردہ سلطنت عثمانیہ کے وسیع و عریض علاقوں سے دستبرداری کو قبول کرلیا تو برصغیر میں جمعیت العلمائے ہند کے سیکرٹری مولوی عبدالباری نے فتویٰ صادر کردیا کہ انگریزوں کے ماتحت ہندوستان دارالحرب ہے اس لیے مسلمانوں کو یہاں سے ہجرت کردینی چاہیے۔ یاد رہے کہ سلطنت عثمانیہ کا زوال اور عبرتناک انجام دیگر محرکات کے علاوہ اسی قسم کے فتویٰ باز ملاؤں کی بدولت ہوا تھا جو مذہب کے نام پر ہمیشہ اس کی سیاسی' معاشرتی اور معاشی ترقی کی راہ میں حائل ہوتے تھے جبکہ مدمقابل یورپ کے ممالک ہمہ گیر ترقی کی راہ پر تیزی سے گامزن تھے اور ان کی صنعتی وفوجی قوت میں روز بروز اضافہ ہورہا تھا' تاہم مولوی عبدالباری کے مذکورہ فتویٰ کی مولانا محمد علی جوہر' مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے خلافتی رہنماؤں نے بھی حمایت کی۔ اس فتویٰ کا اثر قبول کرکے مسلمانوں کے ادنیٰ درمیانہ طبقے کے تقریباً 18 ہزار نیم تعلیم یافتہ افراد اپنا سب کچھ بیچ باچ کر اپنے اہل وعیال کے ہمراہ ''دارالحرب'' ہندوستان کو چھوڑ کر ''دارالسلام'' افغانستان کی جانب چل پڑے۔ جب وہ اس برادر اسلامی ملک کے علاقے میں پہنچے تو وہاں کی حکومت نے انہیں سرحد پر ہی روک دیا اور ان خانماں برباد مہاجرین کو افغانستان میں رہنے کی اجازت نہ دی گئی لہٰذا انہیں ذلیل وخوار ہوکر واپس اپنے گھروں کو آنا پڑا اور راستے میں ان میں سے بہت

سے لوگ فاقہ کشی اور مختلف امراض میں مبتلا ہوکر جاں بحق ہوگئے۔ مذہبی جذبے سے مغلوب ہوکر مصائب برداشت کرنے والے ان مہاجروں میں پنجاب، سندھ اور سرحد کے رہنے والوں کی تعداد زیادہ تھی۔ ایک غیر سرکاری اندازے کے مطابق جن لوگوں نے تحریک ہجرت میں حصہ لیا تھا ان کی تعداد 5لاکھ سے 30لاکھ تھی۔ (5) وہ لوگ نہ افغانستان میں رہ سکتے تھے اور اگر واپس اپنے گھروں کو جاتے تھے تو ان کے پاس اب زمینیں نہیں تھیں اور کاروبار بند ہوچکے تھے۔ مہاجرین کی کثیر تعداد خصوصاً بوڑھے، عورتیں اور بچے سفر کی صعوبتیں برداشت نہیں کرسکے اور راستے میں جاں بحق ہوگئے۔ پشاور سے کابل تک کی سڑک ان بدنصیب بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کی قبروں سے بھر گئی تھی اور جو زندہ واپس پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے ان کے پاس نہ تو کوئی پیسہ تھا اور نہ ہی کوئی ذریعہ روزگار تھا۔ لیکن مولوی عبدالباری اور دیگر فتویٰ باز ملاؤں نے جن کے ایما پر یہ لوگ ''دارالحرب'' سے ''دارالسلام'' ہجرت کرکے گئے تھے، وہ ان کی مصیبتوں میں شریک نہ تھے۔ ملاؤں کی سیاست نے انہیں کہیں کا نہ چھوڑا تھا۔ وہ بالکل تباہ و برباد ہوگئے تھے۔

اسی طرح بعض لوگ کسی نہ کسی طرح ترکی پہنچنے میں کامیاب ہوگئے جنہیں وہاں سے خلافت کے خاتمے کے نتیجے میں بے نیل و مرام واپس لوٹنا پڑا تھا اور ان کے خاندان بھی تباہی و بربادی سے دوچار ہوئے۔ یاد رہے کہ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے نہ تو تحریک خلافت میں حصہ لیا اور نہ تحریک ہجرت کی حمایت کی۔ ان کا ہیرو سلطان ترکی خلیفہ عبدالوحید نہیں بلکہ نئے سیکولر قوم پرست ترک جمہوریہ کا صدر مصطفی کمال پاشا تھا جس نے 1924ء میں خلافت کا منصب ہمیشہ کے لیے ختم کردیا اور نیا آئین بنایا جس میں کہا گیا کہ جو عناصر سیاسی مقاصد کے لیے مذہب کو استعمال کریں گے انہیں آئین کے تحت سزا دی جائے گی اور پھر برصغیر کے کروڑوں مسلمانوں نے لبرل آزاد خیال محمد علی جناح کو اپنا رہنما بنا کر ان فتویٰ باز ملاؤں اور ان کی مذہبی جماعتوں کو رد کردیا اور پاکستان حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ جس طرح سید احمد بریلوی کی وہابی تحریک کے برعکس سرسید احمد خاں کی علی گڑھ تحریک نے مسلم عامتہ الناس کو فائدہ پہنچایا تھا، اسی طرح تحریک خلافت کے

مسلمانوں پر منفی اثرات ہوئے اور اس کے برعکس محمد علی جناح کی ترقی پسندانہ قیادت نے پاکستان حاصل کر کے برصغیر کے شمال مغرب اور شمال مشرق کی وسیع مسلمان آبادی کی ترقی کا سامان پیدا کیا تھا۔

حالیہ تاریخ میں ایک بڑی مثال نام نہاد افغان جہاد کی ہے جس میں دنیا بھر سے بالعموم اور پاکستان سے بالخصوص ہزاروں مسلمان نوجوانوں نے گھر بار چھوڑ کر حصہ لیا اور ایک دردناک انجام سے دوچار ہوئے۔ افغانستان ستر کے عشرے کے اواخر میں دو سپر طاقتوں امریکہ اور سوویت یونین کے مابین سرد جنگ کا میدان کارزار بن گیا۔ پاکستان کہ جس کے حکمرانوں نے اسے اپنے قیام کے دن سے مکمل طور پر اینگلو امریکی سامراج کی جھولی میں ڈال دیا تھا، آگے بڑھ کر افغانستان میں کود پڑا اور اسے اسلامی جہاد کا نام دے دیا گیا۔ امریکی سامراج اور اس کی حلیف مغربی یورپی طاقتوں نے اپنی تجوریوں کے منہ کھول دیئے۔ یہودی لابی اور اس کے سرغنہ امریکی قومی سلامتی کے مشیر برزنسکی نے پشاور میں آ کر اپنے ''دست مبارک'' سے جہادی تنظیموں کو امداد تقسیم کی۔ آج کے اسلامی انتہا پسند بار بار قرآن مجید کی اس آیۃ مبارکہ کا حوالہ دیتے ہیں لیکن اس وقت انہیں یہ کبھی یاد نہ آئی کہ ''یہود و نصاریٰ کبھی مسلمانوں کے دوست نہیں ہو سکتے'' (قرآن 5/51)۔ مغربی میڈیا نے افغان مجاہدین کے کارنامے بڑھا چڑھا کر بیان کرنے شروع کیے۔ جعلی مقابلے تک فلما کر مغربی میڈیا پر دکھائے جاتے تھے۔ جتنی فتوحات افغان مجاہدین کی پیش کی جاتی تھیں اس حساب سے کئی افغانستان ملا کر فتح ہو چکے تھے۔ دوسری طرف پاکستان میں مذہبی جہادی تنظیموں کے لیے جہاد کا یہ کاروبار خوب چمکا۔ جن ملاؤں کے پاس بائیسکل تک نہ تھی اب پجارو گاڑیوں میں گھومنے پھرنے لگے۔ ضیاء الحق کی سرپرستی میں فرقہ وارانہ تنظیمیں خودرو جھاڑیوں کی طرح پورے ملک میں پھیل گئیں۔ مغربی ملکوں سے آنے والے اسلحہ کے جو انبار لگا دیئے گئے تھے، سربرآوردہ جرنیلوں نے اس کا ایسا کاروبار کیا کہ ان کی اگلی نسلیں بھی کروڑ پتی بن گئیں۔ ان جرنیلوں نے منشیات کے کاروبار کو بھی فروغ دیا اور سوئٹزرلینڈ میں ان کے بینک بیلنس آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ لیکن اس سادہ لوح مسلمان کو کیا ملا جو

مراکش، تیونس، الجزائر، مصر، شام، اردن، سعودی عرب اور شیشان سے یہاں جہاد کرنے کی غرض سے پہنچ گیا تھا' علاوہ ازیں پاکستان بالخصوص صوبہ سرحد سے بے شمار نوجوان اس جہاد میں حصہ لینے وہاں پہنچ گئے۔

89ء میں سوویت یونین کے افغانستان سے یک طرفہ انخلاء کے بعد ان جہادی تنظیموں میں حکومت سازی پر اتفاق نہ ہوسکا۔ مکہ میں بیت اللہ شریف میں بیٹھ کر معاہدہ کر لینے کے باوجود یہ ایک دوسرے پر اعتماد نہ کر سکے اور 1989ء سے 2001ء تک بارہ سال تک خانہ جنگی میں مبتلا رہے۔ کوئی ''اسلامی اتحاد و اخوت'' ان کے مابین قائم نہ ہوسکا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس خانہ جنگی کو بھی جہاد قرار دیا جاتا رہا جس میں ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا گلا کاٹنے میں مصروف تھا۔ عام سادہ لوح مسلمان نوجوان جو باہر سے وہاں گیا تھا، مختلف مذہبی تاویلوں کے تحت اس خانہ جنگی کو بھی جہاد سمجھ کر اس میں حصہ لیتا رہا۔ تا آنکہ 9/11 کا واقعہ ہوا۔ امریکی سامراج اپنی فضائی اور زمینی افواج کے ساتھ وہاں کود پڑا۔ کابل اور قندھار سے تورابورا کے غاروں تک امریکی فضائی بمباری سے ہزاروں افراد مارے گئے یا زخمی ہوئے۔ بے شمار جہادی یا تو مارے گئے یا گرفتار ہوگئے یا لٹے پٹے سرحد عبور کر کے پاکستان واپس پہنچ گئے۔ بے شمار افراد کے خاندان اجڑ گئے۔ بے شمار نوجوانوں کی تعلیم برباد ہوگئی۔ دینی مدرسوں میں تربیت یافتہ ہزاروں نوجوان جنہیں ''طالبان تحریک'' کے ذریعے جہاد میں جھونک دیا گیا تھا' زیادہ تر غریب کسانوں یا بے زمین قبائیلوں کی اولاد تھے۔ اب ان کے پاس نہ تعلیم تھی نہ کوئی ہنر اور نہ روپیہ کہ کوئی کاروبار کر سکیں۔

گزشتہ دو سو سال کی تاریخ سے صرف برصغیر میں یہ تین بڑی مثالیں دی گئی ہیں جن کے نتائج کم و بیش ایک جیسے نکلے۔ ٹھوس زمینی حقائق اور عالمی سیاست سے لاعلمی اور جدید تقاضوں سے بے بہرہ مذہبی قیادت کے ہاتھوں سادہ لوح مسلمانوں کو ہر مرتبہ شدید نقصان، مایوسی اور بربادی سے دوچار ہونا پڑا۔ بعض دیگر مثالیں بھی ہیں جن کا محض سرسری تذکرہ کروں گا۔

(1) خاکسار تحریک: علامہ عنایت اللہ مشرقی نے بیلچہ بردار دستوں پر مشتمل ہزاروں

نوجوانوں کو تیار کیا۔ وہ بیلچہ کے ذریعے ہندوستان کو فتح کرنا چاہتے تھے اور لال قلعہ پر اسلامی جھنڈا لہرانا چاہتے تھے۔ اس کی ناکامی سے سب ہی واقف ہیں۔

(2) اینٹی قادیانی تحریک: 53ء میں۔ اور پھر 74ء میں انہیں غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا گیا۔ بے شمار احمدی ملک چھوڑ کر چلے گئے۔ بہت سی جگہوں پر احمدیوں کو کلمہ پڑھنے بلکہ اسلام علیکم کہنے کے جرم میں تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ بعض کو بے رحمانہ طور پر مار ڈالا گیا۔

(3) مشرقی پاکستان میں مہاجر بہاریوں نے 71-1970ء میں پاکستانی فوج کی سرپرستی میں جماعت اسلامی کی ذیلی نیم مسلح تنظیموں ''البدر'' اور ''الشمس'' کو قائم کیا اور بنگالی عوام کے خلاف پاکستانی فوج کے لیے مخبری کے علاوہ بنگالیوں کے خلاف مسلح کاروائیوں میں بھی حصہ لیا جسے یہ لوگ جہاد کا نام دیتے تھے۔ سقوط مشرقی پاکستان کے بعد ان میں جو صاحب حیثیت تھے وہ مغربی پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہوگئے لیکن ان کا اکثر غریب طبقہ وہاں مہاجر بہاری کیمپوں میں محصور کر دیا گیا جو ابھی تک بے حال زندگی گزار رہا ہے۔

(4) 1977ء میں ذوالفقار علی بھٹو کو اقتدار سے ہٹانے کے لیے پی این اے نے انتخابات میں مبینہ دھاندلی کو بنیاد بنا کر تحریک چلائی جس میں مذہبی نعروں کو استعمال کیا گیا اور نفاذ اسلام کو اس کا نصب العین قرار دیا گیا۔ اس کے نتیجہ میں بھٹو حکومت کا خاتمہ اور مارشل لاء کا نفاذ عمل میں آیا اور مذہبی جماعتوں کو سرکاری سرپرستی میں خوب پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ ہر مذہبی جماعت کا اپنا اپنا ''نفاذ اسلام'' تھا اور ضیاء الحق کا اپنی آمریت کو طول دینے کے لیے اپنا ''نفاذ اسلام'' تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ معاشرہ میں موجود سینکڑوں برس سے قائم فرقہ وارانہ ہم آہنگی تار تار ہوگئی اور خود رو فرقہ وارانہ مسلح تنظیمیں وجود میں آ گئیں۔ ضیاء حکومت اور سعودی حکومت نے چند مخصوص تنظیموں کی مالی اور عملی سرپرستی کی جبکہ ایرانی حکومت نے دوسرے فرقے کی مسلح تنظیموں کی امداد شروع کر دی۔ مساجد، امام

بارگاہیں، بم دھماکوں کا شکار ہوگئیں۔ عام مسلمان وہاں جاتے ہوئے خود کو ہمہ وقت غیر محفوظ سمجھتا ہے۔ دونوں بڑے فرقوں کے بیشتر علمائے دین قتل ہو چکے ہیں اور یہ سلسلہ بدستور جاری ہے۔ فرقہ واریت کا دائرہ عیسائی عبادت گاہوں تک بڑھا دیا گیا جن کے ساتھ تعلیمی درسگاہیں بھی منسلک ہیں، بے رحمانہ قتل و غارت کے کئی واقعات رونما ہو چکے ہیں۔ ''نفاذ اسلام'' تو نہ ہوسکا البتہ بے شمار قیمتی جانوں کا زیاں ہو چکا ہے جن میں ڈاکٹر، انجینئر، بینکار، اساتذہ اور دیگر اعلیٰ پروفیشنلز شامل ہیں۔ اور اب اس میں خودکش حملوں کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا ہے۔ مذہبی جنونیت کی انتہا ہو چکی ہے، لوگوں کے ذہن اس حد تک برین واش کر دیئے جاتے ہیں کہ وہ اپنی جان پر کھیل جانے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کے وہ سیدھے جنت میں پہنچ جائیں گے۔

تاریخ فہمی کے مسائل

سادہ لوح مسلمان احیائے اسلام کی ان پرتشدد تحریکوں کا ایندھن بننے کے لیے کیوں تیار ہوتے ہیں؟ ان تصورات یا نظریات کی بنیاد کیا ہے جن کی کشش انہیں ان تحریکوں کا لقمہ بننے کے لیے اپنی جانب کھینچ لیتی ہے؟ ۔عام مسلمان بھی ان تصورات یا نظریات کا اسیر ہے اور بعض اس کنفیوزن میں ہیں کہ ان نظریات کی حمایت کریں یا نہیں۔ دراصل ان کی جڑیں ہماری تاریخ فہمی میں پیوستہ ہیں۔ ہم اپنی تاریخ کو مذہبی لٹریچر کے طور پر پڑھتے اور لکھتے ہیں۔ اور اپنی تاریخ کو اسلامی تاریخ یا تاریخ اسلام کہتے ہیں۔ جبکہ نہ تو یورپ اور امریکہ کی تاریخ کو مسیحیت کی تاریخ اور نہ ہندوستان کی تاریخ کو ہندو تاریخ اور نہ ہی چین جاپان اور مشرق بعید کی تاریخ کو بدھ مت کی تاریخ کہا جاتا ہے۔ کسی عقیدے یا مذہب سے تعلق رکھنے والے حکمرانوں یا بادشاہوں کو تاریخ کو اس دین یا مذہب یا عقیدے کی تاریخ نہیں کہا جاتا۔ اس لئے کہ تاریخ مختلف گروہوں کے مابین اقتدار کی سیاسی کشمکش

اور حکومتوں کے بننے اور بگڑنے کی داستان بیان کرتی ہے اور عام طور سے اسے اس خطے یا گروہ کی تاریخ کہا جاتا ہے۔ ایک ہی عقیدے یا مذہب سے تعلق رکھنے والے جب آپس میں اقتدار کی کشمکش یا ذاتی مفاد کی جنگ کرتے ہیں تو واقعات کے اس تسلسل کو اس عقیدے یا مذہب کی تاریخ نہیں کہا جا سکتا۔ اسے اس عقیدے کے پیروکاروں کی سیاسی تاریخ کہا جا سکتا ہے۔ مذہب یا دین بالخصوص اسلام ایک الوہی معاملہ ہے اور لافانی ہے جبکہ سیاست اور سیاسی نظام اور سیاسی کشمکش ہر دور ہر علاقے اور سماجی ترقی کے ہر مرحلے کے ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہے۔

اب ہم تاریخ کو عقیدے سے جدا کر کے معروضی طور پر ان چار مفروضوں کا جائزہ لیتے ہیں اور جانتے ہیں کہ ہم کس قسم کے مغالطوں کا شکار ہیں۔

1-اسلامی نظام حکومت

اسلامی نظام حکومت سے کیا مراد ہے؟

یہ ایک ایسی تجریدی اصطلاح ہے جس کی واضح تعریف کہیں موجود نہیں ہے۔ کسی نظام حکومت کی بنیادی اکائیاں یہ ہوتی ہیں کہ حکومت قائم کیسے کی جائے؟ حکومت کس طرح چلائی جائے، حکومت میں اختیارات کی تقسیم کن اداروں میں اور کس طرح کی جائے اور آخری مگر ضروری بات یہ کہ حکومت تبدیل کیسے کی جائے؟ ہم مسلمانوں کی سیاسی تاریخ سے ایک ایسے نظام کا خاکہ تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس میں مذکورہ سوالوں کے جواب موجود ہوں۔ آیئے ہم دیکھیں کہ ماقبل اسلام، ابتدائی زمانہ اسلام او رعہد عروج سے دور زوال تک کونسے نظام ہائے حکومت تھے جن پر عمل کیا جاتا تھا۔

ریاست اور سیاسی نظام کا ارتقاء

انسانی تاریخ میں ریاست ہمیشہ سے موجود نہ تھی۔ انسان سینکڑوں ہزاروں سال

ریاست کے بغیر زندگی گزارتا رہا۔ جب دریائی وادیوں میں زرعی انقلاب ہوا۔ وافر دولت Sarplus Wealth پیدا ہوئی تو طبقات نے جنم لیا۔ ان طبقات کے مابین توازن رکھنے، وافر دولت اور غالب طبقوں کی حکمرانی قائم کرنے اور برقرار رکھنے کے لیے ریاستی ڈھانچہ وجود میں آیا۔ اس کا ڈھانچہ موروثی بادشاہت پر مبنی تھا۔ اس کے ابتدائی مراکز دنیا کے بڑے دریاؤں کی وادیاں تھیں۔ 5500 سال پہلے وادی نیل (مصر) اور میسوپوٹیمیا (دجلہ و فرات) میں بادشاہتیں قائم ہوئیں۔ تقریباً اس زمانے یا کچھ بعد چین اور ہندوستان میں بھی موروثی بادشاہتیں قائم ہوئیں۔ 4500 سال پہلے وسطی امریکہ اور جنوبی امریکہ (اگرچہ وہ ایک علیحدہ دنیا تھی) وہاں موروثی بادشاہت پر مبنی ریاست وجود میں آئی۔ پھر یونان، روم اور ایران میں اس قسم کی بادشاہتیں قائم ہوئیں۔ ریاست کا ارتقاء مندرجہ ذیل مراحل میں ہوا۔

☆ شہری ریاست

☆ کئی شہری ریاستیں مل کر سلطنت یا بادشاہت

☆ کئی سلطنتوں پر قبضہ کر کے شہنشاہیت۔ سکندر اعظم پہلا بانی ہوا۔ عالمگیر سلطنت کا۔ پھر اشوک اور پھر رومن ایمپائر۔

☆ Pyramid of Authority کچھ اس طرح تھا کہ سب سے اوپر حکمران خاندان۔ پھر سپہ سالار اور فوجی افسر۔ پھر اہل حرفہ اور اہل فن کا درمیانہ طبقہ اور پھر سب سے نیچے رعیت۔

دوسری طرف وہ علاقے تھے جو دشت و صحرا تھے۔ پیداواری ذرائع محدود تھے۔ وافر دولت موجود نہ تھی۔ طبقات موجود نہ تھے۔ البتہ قبائل موجود تھے جو نسلی وحدت کے طور پر منظم تھے۔ یہ قبیلہ ایک ریاست کی مانند ایک اکائی ہوتا تھا۔ افراد کی وابستگی اور وفاداری اپنے قبیلے کے ساتھ ہوتی تھی۔ علاقے یا سرحدی حدود پر مبنی ملک کی بنیاد پر وطن پرستی کا کوئی تصور نہ تھا۔ قبائل کے سردار اور سربرآوردہ لوگ اپنے اپنے قبیلے کے معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کے ساتھ ویسے ہی معاملات طے کرتا تھا جیسے دو ریاستیں باہم معاملات طے کرتی ہیں۔ معاہدے ہوتے، ٹوٹتے، جنگیں ہوتیں، پھر صلح ہوتی،

نئے معاہدے طے پاتے۔ اسے اینگلز نے قبائلی کنفیڈریسی کا نام دیا ہے۔

دونوں نظام کسی مذہب یا عقیدے سے پیدا نہیں ہوئے تھے بلکہ یہ اپنے اپنے علاقے کی معاشی و سماجی ترقی کے حوالے سے قائم ہوئے تھے۔ ترقی یافتہ سلطنتیں یا بادشاہتیں مختلف مذاہب سے تعلق رکھتی تھیں۔ چین، ہندوستان، ایران، روم، یونان کے بادشاہ، راجہ یا شہنشاہ، کسی کا کوئی مذہب تھا تو کسی کا کوئی اور..... لیکن معاشی و سماجی ارتقاء تقریباً ایک سا ہونے کی وجہ سے یعنی زرخیز دریائی وادیوں کی وافر دولت کی معیشت کی بدولت، ریاست کا نظام ایک جیسا تھا یعنی موروثی بادشاہت۔ ہم اسے اس دور کا مروجہ سیکولر نظام کہہ سکتے ہیں جو بلا لحاظ مذہب دنیا کے مختلف علاقوں میں قائم تھا۔

دوسرا پس ماندہ معیشت یا قلت پیداوار (Deficit) کے علاقوں کا قبائلی نظام جس میں ریاست موجود نہ تھی لیکن بین القبائلی معاہدوں اور جرگوں کی بنیاد پر ایک توازن موجود تھا۔ اس نظام کی اساس بھی مذہب یا عقیدے پر نہیں تھی۔ منگولیا کے صحرائے گوبی کے باشندے ہوں یا شمالی افریقہ کے بربر..... زیریں صحرائے اعظم (Sub Saharan) افریقہ کے جنگلوں کے باسی ہوں یا وسط ایشیا کے ترک یا افغان ..... آسٹریلیا، جنوب مشرقی ایشیا کے جنگلوں کے قبائل ہوں یا ہنوز نامعلوم دنیا یعنی امریکہ کے Indian قبائل ..... سب جگہ ریاست بہ شکل موروثی بادشاہت موجود نہ تھی بلکہ قبائلی کنفیڈریسی کی صورت میں ایک نظام یا توازن قائم تھا۔ گویا یہ دوسرا نظام بھی بلا لحاظ مذہب و علاقہ ایک سیکولر نظام تھا جس کی جڑیں اپنے علاقے کے معاشی و سماجی ارتقاء میں پیوست تھیں۔

ساتویں صدی عیسوی کے اوائل میں بعثت اسلام کے وقت دنیا میں تہذیبی ارتقاء کے حوالے سے وسیع تر تقسیم دو حصوں میں کی جا سکتی تھی۔ ایک وہ جو دریائی وادیوں پر مشتمل تھا اور زرعی اور معدنی دولت سے مالا مال اور سیاسی و سماجی تنظیم کے اعتبار سے زیادہ ترقی یافتہ تھا اور دوسرا وہ جو مادی وسائل کے لحاظ سے پس ماندہ تھا اور دشت و صحرا میں گھومنے پھرنے والے بدوؤں، قبائلیوں پر مشتمل تھا اور سیاسی و سماجی تنظیم کے اعتبار سے پس ماندہ یا ترقی پذیر تھا۔ اول الذکر حصہ میں بڑی تہذیبوں اور بڑی سلطنتوں کے کئی عروج و زوال

ہو چکے تھے جبکہ آخرالذکر حصہ میں ابھی ریاست یا سلطنت وجود میں نہیں آئی تھی۔

جزیرہ نما عرب آخرالذکر نوع سے تعلق رکھتا تھا جہاں ایک قبائلی معاشرہ تھا اور یہاں کوئی باقاعدہ ریاست یا حکومت قائم نہ تھی۔ البتہ اس کی سرحدوں پر بعض پاکٹس Pockets تھیں جہاں ریاست کی شکل موجود تھی۔ ان میں جزیرہ نما عرب کے جنوب میں یمن اور حضرموت کے محدود علاقے میں ریاست رہی تھی جہاں خودمختار موروثی بادشاہت کئی صدیوں تک قائم رہی۔ پھر حبشہ کے فرمانرواؤں اور بعدازاں ایران کے کسریٰ کے زیرنگیں باجگزار صوبے کی حیثیت سے رہی لیکن اس کا کوئی اثر یا غلبہ جزیرہ نمائے عرب کے وسیع تر حصوں یعنی حجاز، نجد اور نفود پر نہ ہوسکا۔ بعثت سے کچھ عرصہ قبل عراق کی سرحد پر بصرہ اور شام کی سرحد پر حیرہ اور غسان کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہوئیں جو دراصل ایرانی سلطنت اور بازنطینی رومی سلطنت کے مابین بفرسٹیٹ کا درجہ رکھتی تھیں اور کبھی ایک اور کبھی دوسری سلطنت کے زیرنگیں ہوجاتی تھیں۔ ایک اور پاکٹ یمامہ و بحرین میں کندہ کی بھی تھی جو ایرانیوں کے زیراثر تھی۔ جزیرہ نما عرب کے ساحلی اور سرحدی علاقوں میں واقع ان پاکٹس کو چھوڑ کر بقیہ تمام جزیرہ نما وسیع و عریض قبائلی معاشرہ پر مشتمل تھا۔ اس میں مکہ، طائف اور یثرب (مدینہ) چھوٹے چھوٹے قصبات تھے مگر یہاں بھی کوئی ریاست موجود نہ تھی۔ قبیلہ کا حاکم سردار ہوا کرتا تھا۔ علاقے یا شہر کا کوئی حاکم یا سلطان نہیں ہوتا تھا۔ افراد کی قومیت کی شناخت قبیلے سے ہوتی تھی اور فرد کی وفاداری اور وابستگی قبیلے کے ساتھ ہوتی نہ کہ کسی علاقائی یا شہری ریاست کے ساتھ۔ خون کے رشتے یعنی قبیلے یا خاندان کو زمینی رشتے کی نسبت زیادہ اہمیت حاصل ہوتی تھی۔ پس ماندہ صحرائی معیشت پر گزارہ کرنے والے اس قبائلی سماج کو ایک باقاعدہ ریاست کی ضرورت بھی نہ تھی۔ ہر قبیلہ اپنی ذات میں ایک ریاست تھا جس کا اپنا رئیس ہوتا تھا۔ ایسے معاملات جو ایک سے زائد قبائل کو درپیش ہوتے، کو طے کرنے کے لیے روایت اور رواج سے کام لیا جاتا جو سینکڑوں سال کے تجربہ سے ان قبائل نے اختیار کیے ہوئے تھے۔ انہیں ''عرف'' کہا جاتا تھا۔ مادی مفادات پر لڑائیاں بھی ہوتیں جن میں پانی کے کنویں، نخلستان، تجارتی قافلوں کے راستے، حج و خانہ کعبہ پر جمع ہونے والے

نذرانے وغیرہ شامل ہوتے تھے۔ پھر صلح اور عہد و پیمان کے لیے صلح و مشورے یعنی جرگے منعقد ہوتے اور جتنے عرصہ کے لیے عہد پر قائم رہتے امن و امان رہتا اور جب کوئی فریق عہد توڑ دیتا، قبائل نئی صف بندی کر کے ایک دوسرے سے نبرد آزما ہو جاتے تھے۔ تا آنکہ ایک نیا معاہدہ طے پا جاتا یا ایک فریق بزور شمشیر اپنا غلبہ منوا لیتا۔ باہمی عہد و پیمان اور قول و قرار کو بے حد اہمیت حاصل تھی اور قبائل اسے اپنی انا کا مسئلہ گردانتے تھے۔ اس کیلئے مرد ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے اور عورتیں زبانی اقرار کرتیں اور اسے بیعت کہا جاتا تھا۔ بیعت توڑنے کو بہت معیوب سمجھا جاتا۔ آپ اسے اس وقت وہاں کا مروجہ سیاسی نظام کہہ سکتے ہیں جس کی بنیاد سیکولر رواج پر تھی نہ کہ مذہب پر۔

ابن ہشام اور طبری کے مطالعہ سے ماقبل اسلام عربوں کے سیاسی نظام میں رائج روایت اور دستور کی یہ چند مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

1- مکہ کے ایک حصے میں بنی اسماعیل اور ان کی ننھال بنی جرہم آباد تھے جبکہ دوسرے حصے میں بنی قطورا۔ جو لوگ مکہ کی بلند جانب سے اس میں داخل ہوتے ان سے بنی جرہم عشر وصول کرتے جبکہ جو نشیبی جانب سے آتے ان سے بنی قطورا عشر لیتے۔ ہر ایک اپنے اپنے قبیلے میں رہتا اور کوئی ایک دوسرے کے پاس نہ جاتا یہاں تک کہ یہ دونوں قبیلے ہوس حکومت میں مقابلہ کرنے لگے اور ان کے مابین جنگ ہوئی جس میں بنی قطورا شکست کھا گئے۔ یہ مکہ میں ہونے والی پہلی لڑائی تھی۔ اس کے بعد قبیلوں کی تمام شاخیں جمع ہوئیں، ان میں صلح ہوگئی اور حاکمیت بنی جرہم کے ہاتھ آئی اور وہ متولّی کعبہ بن گئے۔ اس واقعہ سے یہ روایت یا رواج ظاہر ہوا کہ لڑائی کے باوجود اقتدار کا فیصلہ قبائل کے جرگے میں ہوا۔

2- ایک عرصہ گزرنے کے بعد بنی جرہم کے افراد کے مابین کعبہ میں جمع ہونے والے نذرانوں پر پھوٹ پڑ گئی تو بنی خزاعہ نے صورتحال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بنی جرہم سے جنگ کی اور انہیں مکہ سے نکال دیا اور کعبہ کی تولیت پر قابض ہو گئے۔ گویا فیصلہ شمشیر سے ہوا۔

3- بنی خزاعہ کے آخری متولّی حلیل کے بعد اس کے داماد قصّی بن کلاب اور بنی خزاعہ کے مابین تولیت کعبہ پر ٹھن گئی۔ ایک روایت کے مطابق حلیل نے اپنے داماد قصّی کے حق میں وصیت کردی تھی جس پر قصّی نے اس کے جانشین ہونے کا دعویٰ کردیا۔ قصّی بن کلاب کی بنی خزاعہ سے جنگ ہوئی اور فریقین کے بہت سے لوگ مارے گئے۔ پھر انہوں نے ایک دوسرے کو صلح کی دعوت دی اور عرب ہی میں سے یعرب نامی ایک شخص کو حکم (ثالث) بنانے کی روایت پڑی۔ اس ثالث نے قصّی کے حق میں فیصلہ دے دیا اور تولیت کعبہ، حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمت (سقایہ) اور حاجیوں کی ضیافت (رفادہ)، مجلس شوریٰ (ندوہ) اور پرچم (لواٗ) سب کچھ قصّی کو حاصل ہوگیا۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ ثالث (حکم) کا مقرر کرکے حاکمیت کا فیصلہ کروانا بھی ایک رواج تھا۔ اس کے علاوہ مجلس شوریٰ یا جرگہ کا ادارہ بھی ان قبائل میں موجود تھا۔ بلکہ قصّی نے مشورے کے لیے ایک کمرہ بنایا جس میں قریش اپنے معاملات کے فیصلے کیا کرتے تھے اور اسے دارلندوہ کا نام دیا گیا تھا۔

4 بنی عبدالدار اور بنی عبد مناف میں تنازعہ ہوا اور یہ جنگ کے قریب تر آ گئے مگر پھر صلح اس شرط پر ہوگئی کہ سقایہ اور رفادہ بنی عبدمناف کو دے دی جائے اور حجابہ، لواٗ اور ندوہ بنی عبدالدار کے پاس رہے۔ اسے معاہدہ مطیبعین کہا جاتا ہے۔

5- قصّی کے بعد اس کی آل میں ہاشم اور امیہ کے مابین تنازعہ ہوا تو دونوں نے ایک کاہن الخزاعی کو حکم مقرر کیا جس نے فیصلہ ہاشم کے حق میں دیا۔ پھر عبدالمطلب بن ہاشم اور حرب بن امیہ کے مابین تنازعہ ہوا تو انہوں نے نفیل نامی ایک شخص کو حکم بنایا اور اس نے عبدالمطلب کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ (6)

یہ تھا وہ سیاسی نظام جو بعثت آنحضور ﷺ کے وقت عرب قبائلی معاشرہ میں بطور روایت و رواج کے موجود چلا آتا تھا۔ بعثت کے وقت کعبہ کی تولیت اور حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمت آپ ﷺ کے چچا عباس بن عبدالمطلب کے پاس تھی۔ تاہم مکہ میں کوئی

ریاست یا ریاستی اقتدار نام کی چیز موجود نہ تھی۔ قبائلی سیاسی نظام اپنی روایات و رواج کے مطابق چل رہا تھا۔

علامہ احمد امین کے مطابق ''زمانہ جاہلیت میں حجاز کے عرب بادیہ نشین یا بادیہ نشینوں کی طرح تھے۔ ان کی کوئی منظم حکومت نہ تھی۔ نہ ان کے ہاں ایسے بادشاہ تھے جو اپنی تنفیذی قوت (Executive Power) سے لوگوں کو ایک دوسرے پر زیادتی کرنے سے باز رکھتے۔ ان کے ہاں قبیلے ہوتے تھے۔ قبیلہ کے ہر فرد کا فرض ہوتا تھا کہ وہ قبیلہ کی مدافعت کرے اور اس کے عرف اور رواج کے سامنے سر تسلیم خم کردے۔ ہر قبیلہ کا ایک سردار ہوتا تھا جس کی قیادت تمام افراد قبیلہ پر ہوتی تھی۔ اسے یہ سیادت یا تو اس وجہ سے ملتی تھی کہ وہ رئیس گھرانے میں پیدا ہوا ہے یا اس وجہ سے کہ اس کی عمر سب سے زیادہ ہے یا اس وجہ سے کہ وہ صاحب حکمت اور صاحب عقل ہے۔ دوسرے قبائل سے خارجی تعلقات کی تعین و تشکیل اس سردار کے ہی ہاتھوں سرانجام پاتی تھی..... ہر قبیلہ کے اپنے عرف اور رسوم و رواج ہوتے تھے جن میں سے کچھ تو بعض اوقات مشترک ہوتے تھے اور کچھ الگ الگ..... ہر قبیلہ کا ایک حکم یا فیصلہ کن شخصیت ہوتا تھا جو افراد قبیلہ کے باہم تنازعات کا فیصلہ اپنے رسوم و رواج اور تجربات کے مطابق کرتا تھا۔'' علامہ احمد امین آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ''اسلام نے زمانہ جاہلیت کے قانون، باالفاظ دیگر عربوں کے عرف عام اور ان کے رسم و رواج کے ساتھ بالکل بے تعلقی نہیں برتی۔ ان میں سے بعض باتوں کو برقرار رہنے دیا، بعض باتوں کو ختم کردیا اور بعض باتوں کو معتدل بنا دیا۔''(7)

ہجرت کے بعد آنحضور ﷺ نے مدینہ میں مہاجرین، انصار اور یہودیوں کے مابین ایک معاہدہ طے کیا جسے میثاق مدینہ کہا جاتا ہے۔ اس کے مطابق ہر قبیلے کو ماقبل اسلام سے رائج اپنے اپنے دستور کے مطابق اپنے معاملات چلانے کا حق حاصل تھا۔ یہودیوں کو اپنے دین پر رہتے ہوئے اپنے امور اپنے دستور کے مطابق بجالانے کا اختیار حاصل تھا۔ یہ دراصل قریش مکہ کے خلاف ایک متحدہ محاذ کے قیام کی دستاویز تھی۔ ان میں شریک فریقین کے مابین کسی نئے معاملہ یا تنازعہ کی صورت میں آنحضور ﷺ کی جانب رجوع کرنے کی

شق بھی رکھی گئی تھی جس سے آپ ﷺ کی ذات میں ایک مرکزیت کو تسلیم کرلیا گیا تھا۔ تاہم معروف معنی میں کوئی ریاست قائم نہ کی گئی تھی اور نہ ہی آپ ﷺ نے خود کو حاکم قرار دیتے ہوئے کوئی حکومتی ادارے وضع کیے کہ جن سے عرب قبائل اس سے پہلے ناواقف تھے۔قرآن وحدیث میں آپ ﷺ کی بطور رسول اطاعت پر زور دیا گیا ہے بطور حکمران کے نہیں۔ آپ ﷺ نے رسالت کا دعوی کیا نہ کہ حکمرانی کا۔لوگ اپنے معاملات طے کرنے کے لئے ثالث مقرر کرلیا کرتے تھے۔کئی مرتبہ مسلمانوں نے یہودی کاہن اپنے ثالث مقرر کئے اور کئی مرتبہ یہودیوں نے آنحضرت ﷺ کو اپنا ثالث مقرر کیا اور ان سے فیصلہ کروایا۔ باقاعدہ ریاستی ادارہ عدل موجود نہیں تھا۔لوگ دین میں آپ ﷺ کی اطاعت کرتے تھے دنیوی معاملات میں کسی کے پاس بھی جاسکتے تھے۔

آپ ﷺ نے ہجرت سے قبل مکہ کے قریب عقبہ کی گھاٹی میں انصار مدینہ سے دو مرتبہ بیعت بھی قول وقرار کے مروجہ عرف کے دستور پر لی تھی جو بیعت عقبہ اول اور ثانی کہلاتی ہے۔ اس طرح حدیبیہ میں بیعت رضوان بھی اسی دستور پر لی گئی تھی۔[8] چنانچہ جب آنحضور ﷺ کے انتقال کے بعد آپ کی مرکزیت کے خلا کو پر کرنے کے لیے آپ ﷺ کے جانشین کے تقرر کا مسئلہ درپیش ہوا تو بقول علامہ احمد امین ''اس بارے میں نہ کتاب میں کوئی تصریح موجود تھی نہ سنت میں۔صحابہ کے لیے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہ تھا کہ وہ اپنی رائے کو کام میں لائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔''[9] اور انہوں نے صدیوں سے رائج قبائلی سماج کے عرف ورسوم کے مطابق سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوکر اپنی اپنی رائے اور دلیل دی اور وہی دلیل جو قصی بن کلاب نے قریش کی سیادت کے لیے استعمال کی تھی، اسی دلیل کی بنیاد پر انصار کے دعویٰ کو رد کرتے ہوئے سیدنا حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے حق میں فیصلہ ہوا اور بیعت کی گئی۔عربی لغت میں بیعت کے معنی صفقہ بتائے گئے ہیں جو ہاتھ پر ہاتھ مارکر کوئی عہد یا سودا طے ہو جانے کے ہیں۔ یہ رواج صرف عربوں کے ہاں ہی نہیں بلکہ یورپی قبائل میں بھی Manumissio کے نام سے رائج تھا۔[10] ہاتھ پر ہاتھ مار کر کچھ طے کرنے کے رواج کی جڑیں غالباً انسان کے تہذیبی ارتقاء کے اُس زمانے میں ہیں جب

وہ اشاروں کی زبان (Body Language) سے کام چلاتا تھا۔ گویا ہم اسے تہذیبی ارتقاء سے مربوط ایک عالمی سیکولر دستور کہہ سکتے ہیں۔

دوسری خلافت وصیت یا نامزدگی کے ذریعے طے پائی کہ اس کی بھی روایت قصی کے سسر حلیل کی جانب سے وصیت میں موجود تھی۔ تیسری خلافت کا فیصلہ ایک نامزد مجلس شوریٰ کے ذریعے ہوا۔ یہ بھی قصی بن کلاب کے دارلندوہ یعنی مجلس شوریٰ کی روایت میں رائج چلی آئی تھی۔ تیسری خلافت کا خاتمہ اور چوتھی خلافت کا قیام باغی بلوائیوں کی شمشیروں تلے انجام پایا جو نہ صرف قبائلی سماج بلکہ اس وقت موجود دنیا میں رائج دوسرے نظام یعنی ملوکیت میں بھی اس وقت اختیار کرلیا جاتا تھا جب تنازعہ ناحل پذیر ہوجاتا تھا۔ پھر جب حضرت علیؓ اور امیر شام کے مابین تنازعہ جنگ سے بھی طے نہ ہوسکا تو حکم یعنی ثالث مقرر کرنے کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ یہ بھی عربوں کے عرف و رواج میں صدیوں سے مروّج رہ چکا تھا جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کے ابتدائی 30 سے 40 برس کے دوران جب تک طاقت کا مرکز جزیرہ نما عرب میں یعنی مدینہ میں رہا، مسلمانوں نے صدیوں سے قائم قبائلی سماج کے سیاسی دستور کے عرف و رواج اختیار کیے اور وہ مؤثر بھی رہے۔ مگر جب خلیفہ کی مرکزیت جزیرہ نما عرب یعنی قبائلی معاشرے سے نکل کر ان علاقوں پر محیط ہوئی جو سینکڑوں بلکہ بعض تو ہزاروں برس سے موروثی بادشاہت کے نظام ملوکیت میں رہ رہے تھے تو پھر خلافت کا مرکز بھی انہی علاقوں یعنی دمشق (شام) اور پھر بغداد (عراق) میں منتقل ہوگیا اور مسلمانوں نے قبائلی عرف و رواج کو چھوڑ کر اس وقت کی دنیا کے وسیع حصے میں صدیوں سے رائج نظام ملوکیت کو اختیار کرلیا۔ تاہم دو نظاموں کے مابین یہ تبدیلی (Transition) پرامن نہ تھی۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی شہادت اور پھر کربلا کے دردناک واقعہ سے گزر کر یہ Transition مکمل ہوئی۔ سیاسی نظام خواہ وہ قبائلی عرف و رواج کا تھا یا موروثی بادشاہت کا، کسی صحیفہ آسمانی سے اخذ نہیں کیا گیا تھا بلکہ بنی نوع انسان نے تہذیبی ترقی کے مختلف مدارج طے کرتے ہوئے اپنے تجربے اور مادی تقاضوں سے تشکیل دیا تھا۔

قبائلی عرف و رواج کا مذکورہ سیاسی نظام صرف عربوں ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے دیگر قبائلی معاشروں میں بھی کم وبیش اسی نوع کی مماثلت کے ساتھ پایا جاتا تھا۔ قرون وسطیٰ میں شمالی افریقہ کے بربر اور شمال مغربی چین و منگولیا کے منگول اور تاتاری بھی ایسے ہی خصائص (Traits) کے حامل تھے۔ ابن خلدون اپنے مقدمہ تاریخ میں بربروں کی مماثلت عربوں کے ساتھ کرتا ہے۔[11] اینگلز اسی قسم کے ڈھیلے ڈھالے سیاسی نظام کو قبائلی وفاق (Tribal Confederacy) قرار دیتا ہے اور بیشتر یورپی، امریکی اور آسٹریلوی قبائل کی مثالیں دیتا ہے۔[12] خود ہمارے ہاں افغانستان، صوبہ سرحد، صوبہ بلوچستان، صوبہ سندھ اور جنوبی پنجاب میں جہاں ابھی قبائلی سماج کی جڑیں مضبوط ہیں، مقامی جرگے زیادہ مؤثر ہیں بہ نسبت کسی ریاستی یا منضبط حکومتی اداروں کے کنٹرول کے۔

خلافت راشدہ کے بارے ابن خلدون لکھتا ہے کہ ''خلافت کی ذمہ داری صرف اسی حد تک محدود تھی کہ لوگوں کو احکام شریعہ کا پابند کیا جائے اور اس نوعیت کی حکومت و سلطنت جو اس زمانہ میں اہل باطل میں رائج تھی، اس کا تصور بھی دماغوں میں نہ تھا..... یہ سب کے سب بزرگ خلفاء مروجہ سلطنت سے دور کا تعلق بھی نہیں رکھتے تھے اور اس قسم کی سلطنت سے دوری کا ایک تو سبب دین تھا جو سادگی کا سب سے اہم سبق دیتا ہے۔ دوسرے ان کی عربی بداوت کہ اس کے طفیل بھی یہ بزرگ تعیش سے دور تھے کیونکہ عرب اس وقت تمام دنیوی حالات اور عیش وعشرت سے بالکل بے تعلق تھے۔''[13] اس پر مولانا محمد حنیف ندوی کا محاکمہ یہ ہے کہ ''خلافت راشدہ کسی ٹکے بندھے نظام کا نام نہ تھا اور نہ اس کا قالب اور ڈھانچہ ہی ایسا دستوری تھا کہ اس کو نظام آئین کی موجودہ اصطلاحوں سے تعبیر کیا جاسکے اور اس سے کسی خاص نظام حکومت پر استدلال کیا جاسکے[14]

عربی کی ایک تصنیف ''تاج'' کا مصنف لکھتا ہے: ''ہم ایرانی بادشاہوں کا تذکرہ کریں گے کیونکہ اس بارے میں وہی ہمارے پیشرو ہیں۔ انہی سے ہم نے ملک اور مملکت کے قوانین سیکھے ہیں اور یہ بھی کہ خواص اور عوام کی کس طرح رتبہ بندی کرنی چاہیے۔ نیز یہ بھی کہ رعیت کا انتظام کس طرح کرنا چاہیے اور ہر طبقہ کو کس طرح کام پر لگائے رکھنا چاہیے۔''[15]

امیر معاویہؓ نے دمشق میں بازنطینی محلات میں رہائش اختیار رکھی اور شاہانہ تزک واحتشام ولباس و پوشاک اختیار کیا تو حضرت عمرؓ نے اس پر ناگواری کا اظہار کیا۔ اس پر امیر معاویہؓ کا جواب یہ تھا کہ میں بازنطینی سلطنت کی سرحد کے قریبی علاقے کا حاکم ہوں، جنگ و جہاد اور تزک و احتشام سے ان پر رعب داب ڈالنے کی ضرورت ہے۔ حضرت عمرؓ نے معاویہؓ کی اس دلیل کو قبول کرلیا۔ (16)

ابن خلدون لکھتا ہے کہ ''عربوں نے جب فتوحات کیں اور فارس و روم کو اپنے اقتدار میں لائے اور ان کے لڑکے اور لڑکیوں سے خدمتیں لینے لگے تو ان کا یہی حال رہا کہ انہوں نے شہریت محکوم ملکوں سے سیکھی ورنہ فتح سے پہلے وہ شہریت کے نام سے ناآشنا تھے۔ جب عربوں نے روم و فارس کو اپنی غلامی میں لیا اور اپنے کاموں میں ان سے خدمتیں لینے لگے، گھر بار کے دھندے ان کے سپرد کیے اور کاموں کے لیے ان میں سے ماہر چنے تو انہوں نے ہر چیز میں اصلاح و درستی اور عمدگی کے راستے عربوں کو سکھائے۔ پھر کیا تھا، عرب نے بھی رنگ بدلا اور اپنے حالات میں شہریت وتمدن کو چوٹی پر پہنچا دیا۔''(17)

موروثی بادشاہی نظام قرون وسطیٰ کا مروجہ دوسرا سیکولر نظام حکومت تھا جس پر بلالحاظ مذہب قدیم مصری، یونانی، رومی، بازنطینی، ایرانی، ہندوستانی، چینی سلطنتیں اور ریاستیں قائم و دائم تھیں۔ یہ نظام دنیا کی بڑی دریائی وادیوں کے زرعی معاشروں سے حاصل ہونے والی وافر دولت کی بنیاد پر قائم ہوا تھا۔ چنانچہ اس کے مراکز وادی نیل، وادی دجلہ وفرات، (بابل و نینوا)، وادی ڈینیوب، وادی جیحوں و آمو دریا، وادی سندھ، وادی گنگا و جمنا، وادی برہم پترا، وادی کرشنا اور گوداوری (جنوبی ہند)، وادی میکانگ (ہندچینی)، وادی دریائے چانگ ژیانگ (چین) وغیرہ شامل رہی ہیں۔ فراعین مصر کی سلطنت، یونان کی سلطنت، روم کی سلطنت، اسیری سلطنت (شام وعراق) ایران کی شہنشاہیت، ہندوستان میں اشوک اور اس کے سابقین کی سلطنت، چین کے شاہی خاندانوں کی سلطنتیں۔ ورود اسلام سے قبل اڑھائی تین ہزار سال کے عرصے میں قائم رہ چکی تھیں اور بنی نوع انسان کے پاس موروثی جاگیری نظام حکومت کا وسیع تجربہ اور پس منظر موجود تھا اور یہ اس وقت دنیا کا سب سے ترقی

یافتہ نظام تھا جو کہ دنیا کے ترقی یافتہ زرعی معاشروں کی تہذیبوں میں رچ بس گیا تھا۔ چنانچہ عرب جب شام، مصر، شمالی افریقہ، اندلس، ایران، وسط ایشیا اور سندھ تک ان علاقوں پر قابض ہوئے جو سینکڑوں بلکہ بعض تو ہزاروں برس سے ملوکیت پر مبنی موروثی بادشاہی نظام کے اندر رہ رہے تھے تو عربوں نے حکمرانوں کے اس مروجہ سیکولر نظام حکومت کو اختیار کر لیا۔ مصر و شام اسوقت بازنطینی سلطنت روم اور عراق و ایران ایرانی شہنشاہیت کے ماتحت تھے۔ یہاں کے لوگ صدیوں سے اسی نظام کے عادی تھے اور حکمران کے بارے میں ان کا تصور موروثی جاگیری بادشاہ یا شہنشاہ ہوتا تھا۔ چنانچہ وہ نئے عرب حکمرانوں کی اطاعت اسی صورت میں کر سکتے تھے کہ یہ بھی ملوکیت کے نظام پر عمل پیرا ہوتے جس میں جاہ و جلال اور شاہانہ شان و شوکت اور رعب اور دبدبہ ایک وسیع و عریض علاقے میں نظم و نسق برقرار رکھنے کے لئے لازمی عناصر ہوتے تھے۔ اس لئے بنو امیہ نے بہت جلد یہ نظام اختیار کر لیا اور شمالی افریقہ سے وسط ایشیا تک پھیلی ہوئی وسیع سلطنت پر حکمرانی کی۔ اقتدار کا مرکز بھی مدینہ سے دمشق منتقل ہو گیا جو کہ بازنطینی سلطنت روم کا سرمائی دارالحکومت تھا اور پھر بغداد، قاہرہ ،قرطبہ، غرناطہ ،خوارزم ،اصفہان ،شیراز ،مشہد ، بخارا ،سمرقند ،کابل ،ھرات اور دہلی ان کے پایہ تخت بنے۔ جہاں مسلمان فرمانراؤں نے اسی موروثی استبدادی نظام و سیاست کو اختیار کیا جس پر ان کے ہم عصر عیسائی ، ہندو اور بدھ مذاہب سے تعلق رکھنے والے یورپ ، ہندوستان اور چین کے حکمران عمل کرتے تھے اور جس پر گزشتہ اڑھائی تین ہزار سال سے دنیا بھر کے فرمانروا بلا لحاظ مذہب و ملت عمل کر رہے تھے۔ تقریباً 1300 سال قبل یعنی 20ویں صدی عیسوی کے اوائل تک مسلمانوں نے سپین (اندلس) سے ملائیشیا و انڈونیشیا تک بے شمار چھوٹی بڑی سلطنتیں بنائیں اور گرائیں مگر دستور سیاست وہی موروثی جاگیری شہنشاہیت یا ملوکیت کا رہا یعنی عقیدہ الگ رہا اور نظام سیاست و حکومت الگ رہا ، دین الگ رہا اور دنیا الگ رہی۔ حکمرانوں نے نہ صرف دنیا کے مروجہ تقاضوں سے خود کو ہم آہنگ کیا بلکہ اس مروجہ استبدادی دستور کو اس قدر بڑھ چڑھ کر اپنایا اور اسے اس کمال مستعدی سے بروئے کار لائے کہ صدیوں تک عروج اور غلبہ حاصل کئے رکھا۔ مسلمان حکمران خواہ وہ عرب تھے یا عجم، صدیوں تک اسی

نظام پر عمل کرتے رہے اور اسے مسلمانوں کے عروج کا دور شمار کیا جاتا ہے۔

چنانچہ نظام حکومت کی بنیاد مذہب پر نہیں ہوتی۔ بنی نوع انسان کے تہذیبی ارتقاء پر ہوتی ہے اور انسانی تاریخ میں یہ تہذیبی ارتقاء مسلسل عمل ہے۔ مسلمان ابتداء میں جزیرہ نما عرب کی قبائلی کنفیڈریشن کے سیکولر نظام پر رہے کہ وہاں تہذیبی ترقی اسی مرحلے تک ہوئی تھی۔ پھر عالمی سطح پر رائج ملوکیت کے موروثی بادشاہت کے سیکولر نظام میں داخل ہوگئے کہ مفتوحہ علاقے تہذیبی ارتقاء کے اگلے مرحلے میں کئی صدیوں سے رہتے چلے آرہے تھے۔ پھر مسلمان حکمرانوں نے بھی دین اور سیاست کو الگ رکھا اور خود علمائے دین نے کبھی سیاسی اقتدار کے حصول کے لیے یا اسلامی حکومت کے قیام کیلئے تحریک نہیں چلائی۔ بعض نے بادشاہوں کی مخالفت تو کی لیکن بادشاہت کی بطور نظام حکومت مخالفت نہیں کی اور اسے غیر اسلامی نظام یا کافرانہ نظام قرار نہیں دیا۔ اہل تصوف نے اسے دنیا داری قرار دے کر اس سے خود کو کنارہ کش رکھا۔ اگرچہ بعض موقعوں پر سلاطین اور شہنشاہوں کی سیاست میں علماء اور صوفیا نے سیاسی کردار بھی ادا کیا۔ تاہم وہ اسی نظام کے دائرے میں رہے جسے ملوکیت کہا جاتا تھا۔

یورپ کے صنعتی انقلاب کے بعد دنیا سیاسی نظام کے اگلے مرحلے میں داخل ہوگئی۔ قرون وسطی کے استبدادی سیاسی نظام کا زوال یورپ کے بورژوا صنعتی انقلاب، بالخصوص انقلاب فرانس سے شروع ہوا اور دنیا میں جمہوری قدروں، جمہوری اداروں، منتخب حکمرانوں، جمہوری سیاسی جماعتوں، عوام کے بنیادی انسانی حقوق، عورتوں کی آزادی وغیرہ کی بنیاد پڑی۔ اس انقلاب کی بنیاد یورپ میں تحریک احیائے علوم تھی جس نے صدیوں پرانے جامد نظریات کا خاتمہ کر کے نئے سائنسی تصورات پیش کئے اور جدید سائنس و ٹیکنالوجی کا آغاز ہوا۔ یورپ اس ترقی یافتہ نظام کی بدولت ایشیاء کی زوال پذیر جاگیری سلطنتوں پر غلبہ پانے میں کامیاب ہوا۔ مسلمانوں کی موروثی جاگیری سلطنتیں یورپی اقوام کے اس ترقی یافتہ نظام کا مقابلہ نہ کر سکیں اور نہ کر سکتی تھیں۔ چنانچہ بہت جلد اپنے انجام کو پہنچ گئیں۔ مغل سلطنت، ایران کی بادشاہت اور سلطنت عثمانیہ، دیمک زدہ، کرم خوردہ بوسیدہ

دیوار کی طرح گر گئیں۔ کروڑوں مسلمان عوام یورپ کے غلام بن گئے۔ اس کی وجہ ہرگز یہ نہ تھی کہ مسلمان فرمانروا اسلامی نظام سے دور ہو گئے تھے اور قرون وسطی کے بادشاہوں کا ''اسلامی دستور'' ترک کر چکے تھے بلکہ اس کی صاف سیدھی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے تقلید جامد کو مذہبی تقدس بخش دیا اور نئے سائنسی علوم اور ٹیکنالوجی کو اختیار نہ کیا اور جدید جمہوری نظام اور اس کے ادارے قائم نہ کئے۔ جبکہ انہی ایشیائی جاگیری سلطنتوں میں جاپان، چین، کوریا اور تائیوان نے جبکہ مسلمان ممالک میں صرف ملائشیا نے وقت کے بدلتے تقاضوں کو قبول کیا اور سائنس و ٹیکنالوجی اور جدید نظام کو سینے سے لگا کر دنیا کی ترقی یافتہ اقوام کی صف میں شامل ہو گئے۔ بیشتر مسلمان ممالک قرون وسطی کی بادشاہتوں یا آمریتوں کے تحت ہیں اور یہاں کے عوام بالعموم اور پڑھا لکھا طبقہ بالخصوص، کنفیوژن کا شکار ہے۔ جدید اور قدیم کے مابین، مشرق اور مغرب کے مابین، ''اسلامی نظام'' اور عہد حاضر کے جمہوری نظام کے مابین اور اسی کنفیوژن میں وہ مذہبی انتہا پسندوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔

2- اسلامی اتحاد اور مسلم اُمہ کا تصور

دوسرا بڑا تاریخی مغالطہ یہ ہے کہ ماضی میں مسلمانوں کا عروج اس لیے تھا کہ مسلمان متحد تھے اور ایک امت واحدہ کی حیثیت سے عمل کرتے تھے۔ اگر ایک بار پھر مسلمانوں میں ویسا ہی اتحاد قائم ہوجائے تو پھر ویسا ہی غلبہ وعروج حاصل ہوسکتا ہے اور اس اتحاد کے تصور کے لیے ''مسلم امہ'' کی اصطلاح استعمال کی جا رہی ہے۔ انسانی تاریخ شاہد ہے کہ اتحاد عقیدہ کی بنیاد پر نہیں بلکہ ہمیشہ مشترکہ مفاد کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔ اسی طرح دشمنی و عداوت بھی محض عقیدہ کی بنا پر پیدا نہیں ہوتی بلکہ مفاد کے ٹکراؤ سے پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ اگر عقیدہ سمجھ کر نہیں بلکہ انسانی تاریخ سمجھ کر کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ پیغمبر ﷺ اسلام سے لے کر آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مسلمان متحد رہے ہوں اور ان میں نفاق، اختلاف، دشمنی اور عداوت موجود نہ رہی ہو۔ یہ بات

صرف مسلمانوں پر موقوف نہیں، دوسرے مذاہب و عقائد کے ماننے والے بھی باہمی مفادات پر لڑتے جھگڑتے رہے اور متحد نہ ہوئے۔ مسلم بھائی چارہ اور اسلامی اخوت جیسی اصطلاحیں خطبوں اور نصیحتوں میں تو ملتی ہیں لیکن ان کی عملی شکل کبھی دیکھنے کو نہیں ملی۔ آنحضرت ﷺ کا تاریخی خطبہ جو آپ ﷺ نے حجتہ الوداع 10ھ میں فرمایا تھا کہ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں اور جس میں عربی و عجمی، کالے اور گورلے، امیر و غریب کے امتیاز کو ختم کر کے تقویٰ کو فضیلت کی بنیاد ٹھہرایا تھا۔ اسکے باوجود عرب قبائل کی عصبیتیں ختم نہ ہوئیں تھیں۔ ماقبل اسلام کے قبائلی نظام میں قبائلی عصبیتیں بڑی شدید تھیں اور اس کی جڑیں صدیوں پرانی تھیں اور اسلامی تعلیمات سے یکا یک دور نہ ہوئی تھیں۔ بقول علامہ امین ''ان تعلیمات کے باوجود عصبیت کا رجحان مٹ نہیں گیا تھا۔ جب کبھی عصبیت کو بھڑکانے والی کوئی چیز ظاہر ہوتی تھی، تو یہ عصبیت پوری قوت کے ساتھ سر اٹھا کر کھڑی ہو جاتی تھی۔''

اگرچہ آپ ﷺ کی حیات طیبہ اور پہلی دو خلافتوں کے دوران بھی یہ عداوتیں ابھرتی رہتی تھیں مگر شدید ہونے سے پہلے دب جاتی تھیں جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ شام، مصر، عراق و ایران کے وسیع و مالدار علاقوں کی فتوحات میں سب مصروف ہو گئے تھے اور ان کو فقید المثال کامیابیاں اور بے اندازہ مال غنیمت حاصل ہوا تھا۔ تاہم تیسری خلافت کے زمانے میں تمام دبے ہوئے تضادات ابھر کر شدید ہو گئے۔ خلیفہ ثالث مسلمان بلوائیوں اور خلیفہ چہارم مسلمان خوارج کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ دو بڑی لڑائیاں اکابر صحابہ اور اہل بیت کے مابین جنگ جمل اور جنگ صفین کی صورت میں لڑی گئیں اور اس کے کچھ ہی عرصہ بعد سانحہ کربلا درپیش ہوا۔ بقول احمد امین ''جب خلافت بنی امیہ کے ہاتھوں میں پہنچ گئی تو پرانی عصبیت پھر اسی حالت پر لوٹ آئی جیسا کہ وہ زمانہ جاہلیت میں ہوا کرتی تھی۔ بنو ہاشم اور بنو امیہ کے درمیان زمانہ اسلام میں بھی قطعاً وہی عصبیت موجود تھی جو زمانہ جاہلیت میں ہوا کرتی تھی۔ ان کا یہ جھگڑا اور منافرت زمانہ جاہلیت کی باہمی منافرت کی سچی تصویر ہوا کرتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی زمانہ اسلام میں عدنانی اور قحطانی قبائل میں بھی پرانی نزاع زندہ ہو چکی تھی۔ چنانچہ دونوں قبائل میں ملک کے ہر حصے میں دشمنی و عداوت بلکہ جنگ و جدال کا

بازار گرم تھا۔ اگرچہ مختلف علاقوں میں ان کے نام ذرا مختلف تھے مثلاً خراسان کے اندر بنو ازد اور بنو تمیم کے مابین جنگ برپا تھی۔ ان میں سے بنو ازد یمنی ہیں اور دوسرے عدنانی ہیں۔ شام کے علاقہ میں بنو کلب اور بنو قیس میں معرکہ کارزار گرم تھا جن میں سے بنو کلب یمنی (یعنی قحطانی) اور بنو قیس عدنانی ہیں۔ یہی حالت اندلس میں تھی اور بعینہٖ یہی کچھ عراق میں ہو رہا تھا۔"(18)

90 سالہ عہد بنو امیہ میں مسلمانوں کے مابین بے شمار چھوٹی بڑی جنگیں ہوئیں تاہم گیارہ بڑی جنگیں ہوئیں جن میں مجموعی طور پر مارے جانے والوں کی تعداد لاکھوں میں ہے۔(19) ان میں سانحہ کربلا، مدینہ اور مکہ پر دو مرتبہ اموی مسلمان فوج کا حملہ بھی شامل ہے جس میں سے ایک کی قیادت حجاج بن یوسف نے کی تھی۔ دونوں حملوں میں خانہ کعبہ پر منجنیق سے پتھر اور آگ کے تیر برسائے گئے یہاں تک کہ وہ منہدم ہو گیا اور مسجد نبوی کی بے حرمتی کی گئی۔ دونوں مقدس شہروں میں ہزاروں مسلمانوں کو شام کے مسلمان لشکر نے تہہ تیغ کیا۔ حجاج بن یوسف نے کوفہ میں ایک لاکھ 30 ہزار مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ مختار ثقفی نے قاتلین حسینؓ کو عبرت ناک موت دی۔ مصعب بن زبیرؓ اور مختار کے مابین جنگ میں مختار قتل ہوا۔ حجاج اور مصعبؓ کے مابین جنگ میں مصعبؓ مارا گیا۔ اندلس میں فتح پاتے ہی فاتح مسلمانوں کے مابین خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ یمنی، مضری، ربیعہ، مدنی عرب، شامی عرب اور بربروں کے مابین مسلسل خانہ جنگی کے نتیجے میں ہزاروں مسلمان، مسلمانوں کے ہاتھوں تہہ تیغ ہوئے۔ خراسان میں بھی یمنیوں اور حجازیوں میں معرکہ آرائی جاری رہی۔ مدینہ پر خارجیوں کا حملہ اور قتل عام ہوا۔ خلافت (سلطنت) کے دو دعویداروں ابراہیم بن ولید اور مردان بن محمد کے مابین خونریز جنگ۔ یزید ثالث کی لاش کو قبر سے نکال کر سولی پر چڑھایا گیا۔ عراق، شام اور مصر میں بنو امیہ اور بنو عباس کے داعیوں کے مابین خونریز لڑائیوں میں ہزاروں مسلمان، مسلمانوں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اُتارے گئے۔ آخری اموی خلیفہ مردان بن محمد مارا گیا۔ اسکے علاوہ اموی دور میں دو خلیفہ قتل ہوئے۔ ایک مردان بن الحکم اور دوسرے ولید بن یزید۔ اس دور میں جن اہم شخصیات کو خلیفہ کے حکم یا اشارے

سے قتل کیا گیا، ان میں فاتح سندھ محمد بن قاسم، فاتح وسط ایشیا مسلم بن قتیبہ، فاتح اندلس موسیٰ بن نصیر کے تمام بیٹے شامل تھے جبکہ خود موسیٰ کسمپرسی کی حالت میں مرے۔ علاوہ ازیں اہل بیت کے 72 افراد کربلا میں اور اس کے بعد شیعوں کے آئمہ علی زین العابدینؒ ، باقرؒ اور جعفرؒ زہر دے کر شہید کیے گئے اور زید شہید بن علی اور یحییٰ بن زید کو قتل کیا گیا۔ محمد بن قاسم کے بیٹے عمرو نے قتل کے خوف سے خودکشی کر لی۔ بنوعباس کے امام ابراہیم بن محمد کو زہر دے کر قتل کروا دیا گیا۔ یہ تھا اسلامی بھائی چارہ اور مسلم امہ کی اخوت، اس دور میں جسے مسلمانوں کے عروج کا دور کہا جاتا ہے اور جس میں ایک جانب مراکش کے ساحلوں پر بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑائے گئے تھے تو دوسری طرف فتوحات کا سلسلہ سندھ اور وسط ایشیا تک پہنچ گیا تھا۔

امویوں کا زوال اور عباسیوں کا عروج، عجمیوں کا عربوں کے خلاف رد انقلاب تھا جس کی قیادت خراسانی عجمیوں نے کی۔ عباسیوں نے اقتدار پر قبضہ کرتے ہی امویوں کو چن چن کر قتل کیا۔ اموی خلیفوں میں امیر معاویہؓ اور عمر بن عبدالعزیزؒ کو چھوڑ کر سب کی قبروں کو کھدوایا اور جو کچھ نکلا اس کی راکھ ہوا میں اڑا دی گئی۔ عباسی دور میں عجمیوں کو فوج اور اقتدار میں غلبہ حاصل ہو گیا اور انہوں نے عربوں کے ساتھ گزشتہ ایک سو سال کی محکومی کا خوب بدلا لیا۔ اندلس میں علیحدہ اموی سلطنت کے قیام سے مسلم امہ دو سلطنتوں میں بٹ گئی۔ پھر شمالی افریقہ میں حسنی سید ادریس بن عبداللہ نے ایک تیسری سلطنت کی بنیاد رکھی جو شروع میں عبیدین کی سلطنت کہلاتی تھی اور بعد میں فاطمی سلطنت کہلائی۔ عالم اسلام تین سلطنتوں میں بٹ گیا۔ بنوعباس کے دور کو دو حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جس میں خلیفہ کو اپنی حکومت و سلطنت پر کنٹرول حاصل تھا اور دوسرا وہ جس میں اس کی حیثیت محض کٹھ پتلی کی تھی اور مسلمانوں کی مکمل طور پر خودمختار سلطنتیں وجود میں آ گئی تھیں۔ خلیفہ کا اقتدار صرف بغداد اور گردونواح کے کچھ علاقے تک محدود تھا۔ اول الذکر دور میں بھی جا بجا بغاوتیں سر اٹھاتی رہیں اور کہیں بھی مذہب کے نام پر یکجہتی و اتحاد دیکھنے میں نہیں آیا۔

عباسی دور میں تقسیم در تقسیم اور تضاد در تضاد کی صورتیں یہ تھیں۔ (20)

(i) عباسیوں اور امویوں کے مابین تضاد۔ امویوں کا مرکز اندلس بن گیا اور عباسیوں کا بغداد۔ عباسیوں نے کئی مرتبہ شمالی افریقہ کے راستے اندلس پر بیرونی فوج کشی اور امیہ مخالف گروہوں کی مدد سے اندرونی بغاوت کے ذریعے غیر مستحکم کرنے کی کوشش کی۔ شاہ فرانس شارلیمن نے اندلس پر حملہ کیا تو عباسی خلیفہ ہارون رشید نے شارلیمن کو قیمتی تحائف کے ہمراہ سفارت بھیجی۔ اُدھر اموی امیر اندلس حکم بن ہشام نے ایک مرتبہ حملہ کرتے ہوئے اپنی فوجیں اسکندریہ تک پہنچا دی تھیں اور یہاں عارضی قبضہ کرلیا تھا۔ ان کی باہمی جنگوں میں ہزاروں مسلمان سرزمین اندلس اور شمالی افریقہ پر مارے گئے۔ ایک مرتبہ دمشق میں بھی بنی امیہ کے ایک گروہ نے سفیانی نامی سردار کی سرکردگی میں علم بغاوت بلند کیا جسے عباسی طاقت کے ذریعے کچل دیا گیا۔

(ii) عباسیوں اور اہل بیت کے مابین تضاد۔ حسنی سادات نے دو مرتبہ حجاز میں اور ایک مرتبہ عراق میں بغاوت بھڑکائی۔ اول الذکر دو میں محمد نفس ذکیہ، ابراہیم، بیٹے حسین بن علی اور ان کی اولاد اور تیسری میں ابن طباطبا اور ابوسرایا اپنے سینکڑوں ساتھیوں سمیت مارے گئے۔ حرم کعبہ کی بے حرمتی بھی ہوئی۔ زید شہید بن علی کے ماننے والے فرقہ زیدیہ نے پہلے طالقان اور پھر کوفہ میں بغاوت کی، سرکردہ ابوالحسن یحییٰ قتل ہوا۔ امام جعفرؑ صادق مدینہ میں نظر بند رہے۔ امام علی رضاؑ کو زہر سے شہید کیا گیا۔ امام موسیٰ کاظمؑ کا طویل قید میں انتقال ہوا۔ متوکل نے حضرت علیؑ اور امام حسینؑ کے روضوں کو منہدم کروایا، ہل چلا دیئے۔ امام علی نقیؑ اور حسن عسکریؑ کا قید کی حالت میں انتقال ہوا۔ علویوں نے رے، دیلم اور طبرستان میں بغاوت کرکے وہاں اپنی علیحدہ ریاست قائم کرلی۔

(iii) عرب و عجم کا تضاد۔ عباسی اقتدار کا بانی ابومسلم خراسانی عجم سے تھا۔ اس نے اپنے حریف ابوسلمہ کو قتل کرا دیا جو عرب تھا اور خلیفہ سفاح کا معتمد تھا۔ پھر ابوجعفر منصور نے ابومسلم خراسانی کو قتل کرا دیا۔ خراسان سے مسلسل بغاوتیں ہوتی رہیں۔

استاذسیس کی بغاوت کی سرکوبی کی جنگ میں ستر ہزار آدمی مارے گئے۔ مقنع کی بغاوت، اس کی سرکوبی میں بھی ہزاروں افراد مع مقنع قتل ہوئے۔ عجمی خاندان برامکہ کا عروج و زوال ،جعفر برمکی کا قتل اور بقیہ برامکہ کی قید۔ آذربائی جان میں بابک خرمی کی بغاوت اور اس کی سرکوبی، بابک سمیت ہزاروں افراد کا قتل۔

(iv) حکمران عباسی خاندان کے اندرونی تضادات: ابوجعفر منصور نے اپنے چچا عبداللہ بن علی کو قتل کیا کہ وہ اس کا مخالف تھا۔ خلیفہ ہادی کو اس کی ماں خیرزاں نے قتل کرا دیا کہ وہ اپنے چھوٹے بیٹے ہارون کو حکمران بنانا چاہتی تھی۔ خلیفہ امین اور خلیفہ مامون کے مابین تخت نشینی کی خونریز لڑائیاں، امین کا قتل، خلیفہ معتصم نے اپنے بھائی مامون کی اولاد کا صفایا کر دیا کیونکہ اس کے بھتیجے عباس سے بغاوت کا اندیشہ تھا۔ خلیفہ متوکل کو اس کے بیٹے منتصر نے قتل کیا اور خلیفہ بن گیا۔ خلیفہ مکتفی کے مرنے پر دو چچازاد بھائیوں میں تخت نشینی کی جنگ۔ ایک کو خصیے کاٹ کر مروا دیا گیا۔ دوسرا خلیفہ بن گیا جو مقتدر باللہ کہلایا۔ بعد میں مقتدر اپنے بھائی سے جنگ میں مارا گیا جو قاہر باللہ کے نام سے خلیفہ بن گیا۔

(v) امرائے سلطنت کے باہمی تضادات: تیسری صدی ہجری کے وسط میں ترک فوجی امراء غالب ہوگئے اور ان کی باہمی چپقلش سے خلیفہ معزول اور مقرر ہونے لگے۔ اس کے نتیجے میں خلیفہ مستعین کی معزولی اور نظر بندی میں قتل ہوا۔ خلیفہ موید کی معزولی اور قتل، خلیفہ معتز کی معزولی اور اذیت ناک قتل ہوا۔ اسی طرح خلیفہ مہتدی کا قتل ہوا۔ خلیفہ قاہر، خلیفہ متقی اور خلیفہ مستکفی کو علی الترتیب ترک امراء کے مختلف گروہوں نے گرم لوہے کی سلائیاں آنکھوں میں پھروا کر اندھا کیا اور قید میں ڈالا جہاں وہ مر گئے۔ خلیفہ مسترشد اور خلیفہ راشد کو سلاطین سلجوقیہ کی باہمی کشمکش کے نتیجے میں سلطان مسعود سلجوقی نے یکے بعد دیگرے قتل کرایا۔ خلیفہ مستنجد اپنے امراء کے ہاتھوں قتل ہوا۔ پھر امرائے سلطنت کے معزول اور قتل ہونے کا لامتناہی سلسلہ جاری رہا۔ کئی وزیر اور امیر قتل ہوئے۔

(vi) فرقہ وارانہ تضاد: اموی دور میں شیعان علی، شیعان معاویہ، اشعری اور خوارج ہی بڑے فرقے تھے۔ عباسی دور میں حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی، جعفری (شیعہ)، معتزلہ (معقولات پسند)، تقلید پسند (اہل سنت)، راوندیہ، زیدیہ، علویہ، قرامطہ وغیرہ نئے فرقے وجود میں آ گئے۔ ابوجعفر منصور نے امام ابوحنیفہؒ کو قید میں ڈالا اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ اس نے امام مالکؒ کو مدینہ میں نظر بند کیا۔ خوارج نے خراسان اور ماوراالنہر میں تین مرتبہ علم بغاوت بلند کیا۔ ان کی سرکوبی میں پہلی مرتبہ دس ہزار، دوسری مرتبہ تین ہزار اور تیسری بار ان گنت خوارج مارے گئے۔ کوفہ میں حمدان عرف قرمط کا ظہور ہوا جو اسماعیلیوں کی شاخ قرامطہ کا بانی ہوا۔ بحرین سے عراق و شام اور یمن و حجاز تک ان کی دہشت چھا گئی۔ انہوں نے شام اور اردن میں 20 ہزار حاجیوں کو قتل کیا۔ وہ مکہ سے حجر اسود اکھاڑ کر لے گئے۔ سات سال تک حج نہ ہو سکا۔

مامون، مستعصم اور واثق معتزلہ کے ہم خیال تھے۔ چنانچہ انہوں نے مسئلہ خلق قرآن پر امام احمد بن حنبلؒ اور دیگر علماء کو اذیت ناک سزائیں دیں۔ واثق نے اسی مسئلہ پر بغداد کے عالم احمد نصر کو قتل کرا دیا۔ خلیفہ متوکل معتزلہ کے سخت خلاف تھا۔ اس نے چن چن کر معتزلہ اور معقولات پسند علماء کو قتل کیا۔ اس نے واثق کے زمانے کے وزیر ابوزیات کو سخت ایذائیں دے کر قتل کیا۔

علویوں نے مدینہ میں بغاوت کی۔ چار جمعہ نماز نہ ہو سکی۔ بغداد میں شافعیوں اور حنبلیوں کے مابین فسادات میں خلیفہ نے حنبلیوں کے خلاف فتویٰ دیا۔ چوتھی صدی ہجری کے وسط میں آل بویہ کا بغداد میں اقتدار قائم ہوا اور خلیفہ کٹھ پتلی بن کر رہ گیا۔ چونکہ آل بویہ شیعہ تھے، بغداد میں شیعہ سنی فسادات کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔

(vii) عربوں کے قبائلی تضادات: اندلس سے سندھ تک جہاں جہاں عرب سکونت پذیر ہوئے، عباسی دور میں بھی ان کی قبائلی عصبیت ان کے ساتھ رہی۔ فلسطین میں ابوحرب کی قیادت میں عرب قبائل کی بغاوت ہوئی جس کی سرکوبی میں 20 ہزار

آدمی قتل ہوئے۔ جزیرہ نما عرب کے قبائل نے بھی بغاوت کی جن کی سرکوبی میں ہزاروں قتل اور گرفتار ہوئے۔

(viii) بغاوتیں اور نئی سلطنتوں کا قیام اور ان کے باہمی تنازعات: علویہ نے رے، دیلم اور طبرستان میں بغاوت کر کے علیحدہ سلطنت قائم کر لی۔ صوبوں کے والیان نے بھی خودمختاری اور پھر مکمل آزاد سلطنتیں قائم کر لیں۔ مصر کے احمد بن طولون کی علیحدہ سلطنت مصر و شام پر قائم ہوگئی۔ عباسی اور طولونی کے درمیان شام پر غلبے کی جنگ میں طولونی کامیاب رہا۔ زیدیہ نے زنگیوں کی مدد سے بصرہ میں بغاوت کی اور 15 سال تک یہ بغاوت جاری رہی۔ جس کی سرکوبی کی جنگوں میں ہزارہا افراد مارے گئے۔ یعقوب بن لیث نے کرمان، فارس اور خراسان میں صفاریہ سلطنت قائم کر دی۔ ماوراالنہر میں آل سامان نے اپنی خودمختار سلطنت قائم کر لی اور جلد ہی دیلم کی علوی سلطنت اور فارس و خراسان کی صفاریہ سلطنت بھی سامانیوں کے قبضے میں آ گئی۔ چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں عالم اسلام میں خلیفہ بغداد سمیت پندرہ آزاد و خودمختار سلطنتیں موجود تھیں۔ اس کے بعد یہ سلسلہ مزید پھیلتا چلا گیا اور کئی بڑی چھوٹی آزاد سلطنتیں بنتی اور بکھرتی رہیں۔ ان میں بعض میں بظاہر دینی تعلق کی رعایت سے عباسی خلیفہ کا نام بادشاہ کے نام کے ساتھ پڑھا جاتا تھا۔ آل سامان کے زوال سے غزنوی سلطنت قائم ہوئی۔ پھر سلجوقی سلطنت، غوری سلطنت، خوارزم شاہی سلطنت، زنگی سلطنت ،ایوبی سلطنت وغیرہ قائم ہوئیں۔ ان سب کے حکمران مسلمان تھے مگر ایک دوسرے کے بدترین دشمن تھے۔ محمود غزنوی نے سترہ حملے ہندوستان پر کیے مگر اتنے ہی حملے اس نے اپنی ہمسایہ مسلمان سلطنتوں پر بھی کیے، خوارزم، خراسان، فارس اور ملتان کی مسلمان حکومتوں کا خاتمہ کر کے قبضہ کیا۔ اس نے بغداد کے عباسی خلیفہ کو بغداد پر حملے کی دھمکی بھی دی جسے خلیفہ نے بڑی مشکل سے قرآن کا سہارا لے کر ٹالا۔ غزنوی کمزور ہوئے تو سلجوقی اور غوری ابھرے۔ سلجوقیوں نے چھوٹی بڑی

مسلمان سلطنتیں جنگ یا دبدبہ کے زور پر جلد ہی ہڑپ کرلیں اور ایک بڑی سلطنت قائم کرلی۔

غوریوں نے غزنی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔غوری سلطان علاؤ الدین جہاں سوز کے غزنی پر حملے اور مظالم کی خونچکاں داستاں رونگٹے کھڑے کردیتی ہے۔سات روز تک قتل عام ہوا۔ لاکھوں افراد لقمہ اجل بنے ۔ مکانات جلادیئے گئے۔غزنوی سلاطین کی قبریں اکھاڑ کر مردے جلا دیئے گئے۔غزنوی اور غوری دونوں ہی ہمارے ہیرو ہیں۔

سلطان محمد خوارزم شاہ اور خلیفہ ناصرالدین کی دشمنی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چنگیز خاں کی قیادت میں تاتاری یلغار سے عالم اسلام پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ لاکھوں افراد لقمہ اجل بنے۔شہر کے شہر ملیامیٹ ہوگئے۔ ہندوستان کے سلطان دہلی التتمش اور ملتان اور سندھ کے سلطان ناصرالدین قباچہ نے تاتاریوں سے پسپا ہوتے ہوئے جلال الدین خوارزم شاہ کی مدد کرنے کے بجائے بذریعہ جنگ اسے ہندوستان سے فرار ہونے پر مجبور کیا۔ اسی طرح کسی مسلمان فرمانروا بشمول خلیفہ بغداد نے صلیبیوں کی یلغار کے خلاف زنگیوں اور ایوبیوں کی مدد نہ کی۔سو سال تک بیت المقدس پر صلیبیوں کا قبضہ رہا۔

(ix) عباسیوں اور فاطمیوں کا تضاد: دونوں سلطنتیں خلافت کہلاتی تھیں اور ان کے فرمانروا خلیفہ کہلاتے۔ دونوں ایک دوسرے کی تباہی کے لیے کوشاں رہتے۔تاہم فاطمیوں نے اپنی خفیہ تنظیمیں جن میں کام کرنے والے فدائیں یا حشیشین کہلاتے تھے، کے ذریعے عباسی خلیفہ کے مسلک سے وابستہ سلجوقی اور غوری امراء و سلاطین کو قتل کیا۔حسن بن صباح کا قلعہ الموت بڑے بڑے امراء اور حکمرانوں کے لیے دہشت کا منبع بن گیا تھا۔سلجوقی وزیر اعظم نظام اُلملک طوسی کو انہوں نے قتل کیا۔ایک روایت کے مطابق برصغیر میں مسلمان سلطنت کا بانی سلطان شہاب الدین غوری بھی اسماعیلی فدائی کے ہاتھوں قتل ہوا۔ صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں فاطمی خلافت کا خاتمہ ہوا۔

(x) سلطنتوں کے حکمران خاندانوں کے اندرونی تضادات: عباسی خاندان کے

اندرونی تضادات کے علاوہ دیگر جتنی مسلمان سلطنتیں بنتی اور بگڑتی رہیں، ان کے حکمران طبقے باہمی تضادات اور آویزش کا شدت سے شکار رہے۔ سلجوقی تخت نشینی کی جنگیں بعض اوقات بغداد کو بھی لپیٹ میں لے لیتی تھیں۔ جو کوئی بھی بزور شمشیر بغداد پر قابض ہوجاتا، خلیفہ اسی کے نام کا خطبہ اپنے نام کے ساتھ جاری کر دیتا۔ اگر خلیفہ اس کی اطاعت نہ کرتا تو سلطان یا تو خلیفہ کو زبردستی اطاعت پر مجبور کرتا یا پھر خلیفہ یا سلطان کو معزول یا قتل کر دیا جاتا۔ خلیفہ مسترشد اور خلیفہ راشد اسی طرح قتل ہوئے۔ اقتدار کی جنگ میں جس کا پلہ بھاری ہوتا وہ اپنے حریف کو بدترین سزا دیتا۔ گرم لوہے کی سلاخیں آنکھوں میں پھیرنا عام سی بات ہوتی تھی۔ محمود غزنوی اور صلاح الدین ایوبی عالم اسلام کے دو بڑے ہیرو تصور کیے جاتے ہیں، ان کے جانشین اقتدار کی خونریز لڑائیوں کے لامتناہی سلسلہ میں اُلجھ گئے۔ غزنوی کے جانشینوں نے باہمی لڑائیوں اور غوریوں کے خلاف لڑائیوں میں ہندو راجاؤں کی مدد بھی حاصل کی۔ جبکہ ایوبی کے جانشین اپنے اپنے اقتدار کی خاطر صلیبیوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔

یہ تھا کم و بیش پانچ سو سالہ (138ھ تا 656ھ) کے عباسی دور کا اسلامی اتحاد و بھائی چارہ۔ اس میں 37 عباسی خلیفہ ہوئے جس میں سے 14 مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوئے جبکہ ایک آخری خلیفہ کافر تاتاریوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ تاہم اسی دور کے ابتدائی حصے میں مسلمان علمی، فکری اور تہذیبی ترقی میں اپنی معراج پر پہنچے۔ ادب و شعر، فلسفہ، ریاضی، کیمیا، طبیعیات اور طب کے ماہر پیدا ہوئے۔ اس ترقی کا کوئی تعلق ''اسلامی اتحاد و اخوت'' سے نہیں تھا کہ اس کا دور دور نام و نشان موجود نہ تھا۔ ترقی کی وجہ یہ تھی کہ علم پر قدغن لگانے والی اور تقلید جامد کی پیروی کرنے والی قوتیں کمزور تھیں جبکہ علم و فن و ہنر کے حصول اور نئی اختراعات کو فروغ دینے کی معتزلہ جیسی تحریک کو سرکاری سرپرستی بھی حاصل ہوئی اگرچہ عارضی۔ پھر تقلید جامد کا غلبہ ہوا اور ان علوم کا چراغ بجھنا شروع ہوا۔ اس کی جگہ فقیہیت اور ملائیت نے لے لی۔ چنانچہ جب تاتاری یلغار ہوئی تو ماوراالنہر، خراسان، فارس، خوارزم اور

بغداد تک ہر شہر میں فرقہ وارانہ تناؤ اور مولویانہ مباحث عروج پر تھے۔ اشعری، حنبلی، شافعی، شیعہ وسنی تنازعات کا حال یہ تھا کہ کوئی ایک فرقہ تاتاریوں سے امان کا وعدہ لے کر ان کے لیے شہر کے دروازے کھول دیتا تھا کہ دوسرے فرقے کے لوگوں کو تباہ کر دیا جائے۔ مگر حقیقتاً تاتاری امان کا وعدہ بھول کر سب کو تباہ و برباد کر ڈالتے تھے۔

سقوط بغداد کے بعد عالم اسلام کا نیا سیاسی جغرافیہ نمودار ہوا۔ تاتاری سکونت پذیر ہوکر مسلمان ہونا شروع ہوئے اور طاقت کے نئے مراکز اور نئی سلطنتیں وجود میں آئیں۔ ممالیک مصر کی سلطنت مصر، شام اور حجاز و یمن تک قائم ہوگئی، عثمانی ترکوں کی اناطولیہ سے ابھرتی ہوئی نئی سلطنت، وسط ایشیا اور ایران میں تیموری سلطنت، ہندوستان میں سلاطین دہلی، ڈوبتی ہوئی اندلس کی دولت غرناطہ اور دیگر چھوٹی بڑی کئی سلطنتیں۔ عالم اسلام میں اتحاد تب بھی قائم نہ ہوا۔ نئی سلطنتیں ایک دوسرے سے نبرد آزما رہیں اور ایک دوسرے کے عروج و زوال کا باعث بنتی رہیں۔ ممالیک مصر نے قاہرہ میں دکھاوے کا عباسی خلیفہ رکھا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ عثمانی سلطان سلیم اول نے شام اور مصر پر قبضہ کر کے ممالیک سلطنت کا خاتمہ کر دیا اور خلافت کا خرقہ اس کٹھ پتلی عباسی خلیفہ سے اپنے نام منتقل کرا لیا۔ پھر خلافت کے ٹائٹل کو عثمانی ترک سلاطین نے دیگر مسلم ریاستوں کو زیر نگیں لانے کے لیے استعمال کیا۔ تاہم کئی خونریز جنگیں لڑی گئیں۔

سلطنت عثمانیہ یا خلافت عثمانیہ اور تیموری سلطنت اور ہندوستان کے مسلمان سلاطین کا آپس میں کوئی اسلامی اتحاد نہ ہوا۔ امیر تیمور نے چھوٹی بڑی تمام مسلمان سلطنتوں پر حملے کئے اور وہاں اپنا اقتدار مسلط کیا۔ فارس اور عراق پر کئی خونریز جنگوں کے بعد قبضہ کیا اور آل مظفر کے تمام بہادر جوان تہہ تیغ کر دیئے۔ اسکے بعد تیمور کی عثمانی سلطان بایزید کے ساتھ شدید جنگ ہوئی۔ بایزید شکست کھا کر اپنے خاندان سمیت قید ہوا اور اسی حالت میں مر گیا۔ امیر تیمور نے سلطنت دہلی پر حملہ کیا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اتنا قتل عام ہوا کہ اس کی واپسی کے بعد کئی ماہ تک دہلی میں انسانوں کے بجائے صرف چیل کوؤں کا راج تھا۔ عثمانیوں اور ایران کے صفویوں کے مابین تضاد میں سنی۔شیعہ کا مسئلہ بھی درپیش تھا۔ ان

کے مابین خونریز جنگوں میں دونوں طرف کے ہزاروں مسلمان مارے گئے۔ ایک جنگ میں شاہ اسماعیل کو شکست ہوئی اور تبریز پر عثمانیوں کا قبضہ ہو گیا۔ سلطان سلیم اوّل نے شاہ اسماعیل کے دور میں جو سرحدی لوگ شیعہ ہو گئے تھے اور جن کی تعداد چالیس ہزار تھی، سب کو قتل کروا دیا۔ شاہ عباس صفوی نے بغداد پر اور بعد میں نادر شاہ نے موصل اور بغداد پر حملہ کر کے ترکوں کو شکست دی۔ عراق کبھی ترکوں اور کبھی عثمانیوں کے قبضے میں چلا جاتا تھا۔ اندلس کی آخری مسلمان دولت غرناطہ، بنی احمر جب عیسائیوں کے ہاتھوں تباہ ہونے لگی تو ترکی سلطان بایزید سے مدد طلب کی مگر اس نے کچھ زیادہ توجہ نہ کی۔ صرف ایک معمولی بیڑا بھیجنے پر اکتفا کیا۔

عثمانی سلاطین یا خلیفوں کی اندرونی صورتحال یہ تھی کہ جب کوئی جانشین تخت پر بیٹھتا، وہ سب سے پہلے اپنے تمام بھائیوں کو قتل کروا دیتا۔ اگرچہ مراد اول نے اپنے بیٹے صاروجی کو بغاوت کے جرم میں اندھا کیا تھا، بایزید نے اپنے بھائی علاؤالدین کو اور مراد ثانی نے اپنے بھائی مصطفےٰ چلپی کو قتل کیا تھا لیکن اس کا رواج مراد ثالث کے مرنے پر محمد ثالث کی تخت نشینی سے ہوا جس نے تخت پر بیٹھتے ہی اپنے اُنیس بھائیوں کو قتل کروا دیا اور باپ کے ساتھ ہی دفنا دیا۔ پھر اس کو رواج کے طور پر باقاعدہ تسلیم کر لیا گیا، کسی شیخ الاسلام یا قاضی نے اسے خلاف اسلام قرار نہ دیا۔ کئی سو سال رواج رہنے کے بعد اس میں فقط یہ تبدیلی کی گئی کہ مارنے کے بجائے سب بھائیوں کو قید میں ڈال دیا جاتا تھا۔ (21)

ایران کے شاہ اسماعیل صفوی نے شیعہ مذہب کو باقاعدہ سرکاری مذہب قرار دیا اور ہمسایہ مسلمان ریاستوں پر حملے کئے جن میں ترکوں اور افغانوں کے ساتھ زیادہ تر جنگیں ہوئیں۔ ایک افغان حکمران محمود نے قزوین اور شیراز پر قبضہ کر کے وہاں قتل عام کیا۔ ایرانیوں، افغانیوں اور ترکوں کی باہمی جنگوں میں دشمن مفتوح کے سروں کے مینار بنانا، آنکھوں میں گرم سلائیاں پھروانا عام بات تھی۔ عباس شاہ صفوی نے خود اپنے بیٹوں کو قتل کروا دیا تھا کہ کہیں وہ اسے تخت سے نہ ہٹا دیں۔ (22) نادر شاہ افشار ایران کا بادشاہ بنا تو اس نے ہمسایہ مسلمان ملکوں پر یلغار کر دی۔ ہندوستان پر حملہ کیا اور دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

ہندوستان میں سلاطین دہلی کے ادوار میں ترکوں اور افغانوں کے مابین تضاد تھا۔ جبکہ مغلیہ دور میں تورانی اور ایرانی کا تضاد غالب رہا۔ شمالی ہند کے سلاطین اور مغل شہنشاہ سنی العقیدہ تھے۔ ان کا جنوبی ہند (دکن) کی ریاستوں کے شیعہ حکمرانوں کے ساتھ سنی۔ شیعہ تضاد بھی کافرما رہا۔ مغلیہ عہد میں شیخ احمد سرہندی (مجدد الف ثانی) نے شیعہ۔سنی اختلاف کو خوب ہوا دی۔ خود حکمران خاندانوں کے اندر باپ اور بیٹا اور بھائی بھائی کے خلاف تخت نشینی اور اقتدار کی جنگ میں صف آرا نظر آتے ہیں۔ التمش کی اولاد میں تخت نشینی کی جنگ اور رضیہ سلطان کا قتل، جلال الدین خلجی کے ہاتھوں سلطان کیقباد کا قتل، علاؤالدین خلجی کے ہاتھوں اپنے چچا جلال الدین خلجی کا قتل، بابر اور ابراہیم لودھی کے مابین پانی پت کی جنگ میں ابراہیم لودھی کا قتل، بابر کے بیٹوں میں تخت نشینی کی جنگ اور ایک دوسرے کا قتل، جہانگیر کی اپنے بیٹے خسرو سے تخت نشینی کی جنگ اور خسرو کی قید میں موت، شاہجہاں کا تخت نشینی کی جنگ میں اپنے چچیرے بھائیوں، بھتیجوں اور نور جہاں کے داماد شہریار کا قتل اور شاہجہان کے بیٹوں کے مابین تخت نشینی کی جنگ اور اورنگ زیب کے ہاتھوں بھائیوں کا قتل اور پھر خود اس کی اولاد اور اسکے بعد تمام مت آخرین مغلوں کے مابین لڑایاں اور قتل۔ دینی بھائی چارہ اور اخوت تو دور کی بات ہے، خون اور خاندان کا رشتہ بھی ان کے درمیان کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔

ایک مرحلے پر ہندوستان میں پنجاب سے بنگال تک کم و بیش دس علیحدہ آزاد ریاستیں موجود تھیں۔ دہلی، ملتان (لنگاہ)، جونپور (مشرقی)، بنگال، خاندیش، مالوہ (خلجی)، گجرات، دکن (بہمنی)، سندھ، کشمیر، ان کے پایہ تخت تھے۔ پھر دکن کی بہمنی سلطنت بکھر کر پانچ حصوں، قطب شاہی، عادل شاہی، عماد شاہی، نظام شاہی اور برید شاہی میں تقسیم ہوگئی۔ مغلوں نے جنوب کی ریاستوں کو چھوڑ کر بقیہ تمام ریاستوں کو یکجا کرلیا مگر اس کا سہرا جلال الدین اکبر کے سر تھا جو سیکولرازم کا داعی تھا۔ تاہم اس کی انتظامیہ اور بعد کی مغل سلطنت بھی تورانی۔ ایرانی تضاد جسے شیعہ۔سنی تضاد کی شکل دی گئی، کی بری طرح شکار تھی۔ دیگر فرقہ بندیاں اور گروہی مفادات کے ٹکراؤ مسلسل موجود رہے۔ ایران کے نادر شاہ اور افغانستان کے احمد شاہ ابدالی کے حملوں میں دہلی اور پنجاب میں بلا لحاظ مذہب لوٹ مار کی گئی۔ اسلامی

اتحاد و اخوت برصغیر کے مسلم دور میں کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ تاہم ترقی کے اعتبار سے اسے بھی مسلم تاریخ کا درخشاں دور قرار دیا جاتا ہے اور حقیقتاً قرون وسطیٰ کے معیار سے دیکھا جائے تو فن تعمیر، موسیقی، مصوری، شاعری اور دیگر فنون میں یہاں واقعی عروج حاصل ہوا۔ گویا مذہبی اتحاد و اخوت کا تجریدی نظریہ ترقی و تعمیر سے کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا۔

مسلمانوں کی تاریخ کے دور عروج کی یہ چند جھلکیاں یہ سمجھنے کے لئے کافی ہیں کہ مذہب یا عقیدہ اتحاد قائم نہیں کرتا اور نہ ہی عروج و ترقی کا تعلق مذہبی اتحاد و اخوت سے ہوتا ہے۔ ہر کوئی اپنے مفاد کے حوالے سے اتحاد کرتا ہے۔ نہ صرف ظالم اپنے مفاد کے لئے متحد ہو جاتے ہیں بلکہ مظلوم بھی اپنے مشترکہ مفاد کے لئے متحد ہو جاتے ہیں۔ آج امریکی سامراج کے ہاتھوں ظلم و بربریت کا شکار ہونے والے عراقیوں اور افغانیوں کے حق میں غیر مسلم عوام یورپ، امریکہ، جاپان، کوریا اور بھارت میں مظاہرے کر رہے ہیں۔ جبکہ بیشتر مسلمان ممالک کی حکومتیں امریکہ کی اتحادی ہیں۔ ایسے میں مسلمان عوام کے فطری اتحادی وہ غیر مسلم عوام ہیں جو عالمی امن کے مشترکہ دشمنوں یعنی امریکہ اور اسکی حلیف مسلم و غیر مسلم حکومتوں پر مشتمل ہیں۔

3- اسلامی جہاد

تیسرا تاریخی مغالطہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے جہاد کا راستہ ترک کر دیا ہے جیسا کہ قرون اولیٰ اور قرون وسطیٰ میں وہ اختیار کیے ہوئے تھے اور اگر اس راستے کو پھر سے اختیار کر لیا جائے تو پھر سے مسلمان دنیا پر غلبہ پا سکتے ہیں اور اس مفروضے کو بنیاد بنا کر بعض سادہ لوح مسلمان سر پر کفن باندھ کر گھروں سے نکل پڑتے ہیں اور دنیا میں جہاں کہیں بھی ایسی آزادی کی یا مزاحمت کی جنگ ہو رہی ہوتی ہے، جہاں مسلمان لڑ رہے ہوتے ہیں وہاں یہ حضرات جہاد کے نام پر پہنچ جاتے ہیں اور وہاں کے لوگوں کی علاقائی جدوجہد آزادی میں شریک ہو جاتے ہیں۔ ان جوشیلے مسلمانوں کا گھر بار چھوڑنے اور دور دراز مقامات پر جا کر جان پر کھیل جانے کا جذبہ اپنی جگہ قابل تحسین و آفرین ہے لیکن بیرونی عناصر کے مقامی

جدوجہد ہائے آزادی میں شامل ہوجانے سے کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوتا بلکہ بہت سی پیچیدگیاں اور نئے مسائل اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور مقامی باشندوں اور مقامی حریت پسندوں کے ساتھ تضادات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کی حالیہ مثال افغان جہاد ہے۔ جہاں عرب ، پاکستانی، شیشانی اور دنیا جہان سے جہادی آ کر شامل ہوگئے۔ ان بیرونی عناصر کی وجہ سے وہاں سوویت افواج کے انخلاء کے بعد کوئی اتفاق رائے کی حکومت خانہ کعبہ میں قسم کھانے کے باوجود نہ بن سکی۔ پورا ملک خانہ جنگی کی لپیٹ میں آ گیا اور ایک ناکام ریاست بن گیا۔ 11 ستمبر 2001ء کے بعد امریکہ نے طالبان اور القاعدہ کا ہوّا کھڑا کر کے اس علاقے پر اپنے پنجے گاڑنے کے لیے اس علاقے کو دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر ایک نئی جنگ میں جھونک دیا ہے۔

مذکورہ بالا نوعیت کے ''جہاد'' کی مثال مسلمانوں کی تاریخ میں یا تو خوارج کی ہے یا قرامطہ کی۔ خوارج کی نہ اپنی کوئی حکومت تھی اور نہ وہ کسی حکومت یا ریاست کے ماتحت تھے بلکہ اپنے جتھے بنا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ چل پڑتے تھے۔ خوارج جو حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ دونوں سے برگشتہ ہو کر علیحدہ ہوجانے والے مسلمان تھے مگر مذہباً انتہا پسند اور سخت راسخ العقیدہ تھے۔ صاحب العقد الفرید کے مطابق ''تمام اسلامی فرقوں میں خوارج سے زیادہ شدید ترین بصیرت کسی دوسرے فرقہ میں نہیں تھی، نہ ان سے بڑھ کر کوئی اور فرقہ زیادہ جفاکش تھا اور نہ ہی ان سے بڑھ کر کوئی موت کا اتنا والہ و شیدا۔''[23] بقول احمد امین ''وہ چھوٹے چھوٹے گناہ (صغیرہ) کرنے والے کو بھی کافر شمار کرنے لگتے تھے..... وہ غیر خارجی مسلمانوں کو کافر سمجھتے تھے..... ان کے داعی ان سے یوں خطاب کرتے ''آؤ اس آبادی سے نکل چلیں جس کے باشندے ظالم ہیں اور آؤ کسی پہاڑ کی کھوہ کی طرف چل دیں یا کسی دوسرے شہر کی طرف ہجرت کر جائیں جہاں جا کر ہم ان بدعات کا انکار کر سکیں۔''[24] غیر خارجی مسلمانوں کے بارے میں ان کا ایمان تھا کہ ''غیر خارجی لوگ کفار عرب روایت پرستوں کی طرح ہیں جن سے بجز اسلام یا تلوار کے کوئی دوسری چیز قبول نہیں کی جا سکتی۔ ان کا ملک دارالحرب ہے اور ان کی عورتوں اور

بچوں تک کا قتل جائز ہے۔''(25)

چنانچہ یہ خصائص کہ اپنے ہم عقیدہ لوگوں کے علاوہ دوسرے مسلمانوں کو کافر اور واجب القتل سمجھنا، ہمارے ہاں کے جہادیوں کے خصائص کی طرح ہیں جو افغانستان میں 1989ء میں روسی افواج کے انخلاء سے امریکی افواج کی آمد 2001ء تک بارہ سال خانہ جنگی کے دوران دیکھنے میں آئیں اور پاکستان میں فرقہ واریت کی آگ بھڑکانے میں مصروف رہیں اور آج بھی مصروف ہیں۔ خوارج کی تحریک اموی عہد میں بڑی طاقتور تھی۔ وہ اپنے جہاد کو ''خروج فی سبیل اللہ'' قرار دیتے تھے اور اسی وجہ سے خارجی کہلاتے تھے۔ انہوں نے عراق، خراسان اور حجاز میں کئی بار علم بغاوت بلند کیا۔ ہزاروں کی تعداد میں مارے گئے لیکن جان پر کھیل جانے سے گریز نہ کرتے تھے۔ تھوڑی تعداد میں بھی حکومت کی زیادہ فوج سے بھڑ جاتے تھے۔ تاہم وہ کہیں اپنی حکومت قائم نہ کر سکے۔ عباسی دور میں ان کی تحریک ماند پڑ گئی اور بالآخر معدوم ہوگئی۔

قرامطہ اگرچہ مذہبی عقائد کے لحاظ سے خوارج سے مختلف تھے، انہوں نے مہدویت کے نظریہ کی بنیاد پر اپنے عقائد کی بنیاد رکھی تھی۔ تاہم سیاسی مقاصد دونوں کے تقریباً یکساں تھے اور وہ یہ تھے کہ کسی بھی مرکزی حکومت کی حاکمیت کو تسلیم نہیں کرنا اور جب بھی اور جہاں کہیں موقعہ ملے بدنظمی اور بدامنی پیدا کرنا ہے۔ اپنے سیاسی مخالفین اور عوام الناس پر ظلم وستم کرنے میں بھی یہ فرقہ خوارج سے پیچھے نہیں تھے۔ قرامطی بھی جب کبھی کسی علاقے پر غلبہ حاصل کرتے تو بے دریغ لوٹ مار اور قتل و غارت کرتے تھے۔ ان کا داعی حسین القرمطی اپنے لوگوں کو جو فرمان لکھتا تھا ان میں اپنے متعلق کہتا تھا کہ ''.....میں خلاف چلنے والوں کا قاتل، فساد کرنے والوں کا ہلاک کرنے والا اور اہل بصیرت کا چراغ ہوں۔''(26)

ابن خلدون نے مذہب کے نام پر مسلح تحریکیں چلانے والے کئی اور لوگوں کا ذکر بھی کیا ہے جن میں بغداد میں خالد دریوس، سہیل بن سلام، سوس میں توبذری نامی صوفی اور غمارہ میں عباس نامی ایک شخص شامل ہے۔ انہوں نے اپنے پیروکاروں کی کثیر تعداد جمع کر کے ''کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' کے قانون کے نفاذ کے لیے مسلح تحریک

شروع کردی۔ ابن خلدون ان لوگوں کے بارے میں لکھتا ہے ''ان کے بارے میں یہی مناسب ہے کہ اگر یہ مجنون و پاگل ہیں تو ان کا علاج معالجہ کرایا جائے، اگر حکومت میں اختلال وگڑبڑی کرتے ہیں تو مار پیٹ یا قتل کی ان کو سزا دی جائے یا ان کو مسخرہ جان کر ان کے حالات سے اعتنا نہ کیا جائے ..... اکثر کو آپ خبطی، پاگل یا مکار فریبی پائیں گے جو ان نابکار حرکتوں سے اور اس قسم کی دعوت سے ریاست وسرداری حاصل کرنا چاہتے ہیں جس کی آرزو ان کے دل میں سمائے ہوتی ہے۔ اب چونکہ اسباب عادیہ ان کے سازگار نہیں ہوتے، اس لیے یہ اپنے مقصد تک پہنچنے سے عاجز رہتے ہیں۔ اسی لیے یہ تمام اسباب سے کنارہ کش ہوکر دینی ڈھونگ رچاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مذہبی پردہ میں وہ اپنے مقصود کو پالیں گے اور وہ ہلاکی جو ان کو ملنی ہوتی ہے وہاں تک ان کا دماغ ہی نہیں جاتا۔ چنانچہ اسی فتنہ میں وہ فوراً موت کی بھینٹ چڑھتے ہیں اور اپنے کئے کی سزا پاتے ہیں۔''(27)

حقیقت یہ ہے کہ مسلم تاریخ میں فقط دو مواقع ایسے آئے جب واقعتاً جہاد کے اس تصور کا اطلاق ہوسکتا تھا جسے آج کل کا عام سادہ لوح مسلمان جہاد سمجھتا ہے اور جس کے لیے تمام مسلم اُمہّ کو علم جہاد بلند کرنا چاہیے تھا۔ ایک یورپ کے صلیبیوں کی یلغار اور دوسرے تاتاریوں کی یلغار۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ دونوں مواقع پر امت مسلمہ نے کوئی اجتماعی کارروائی نہیں کی۔ نہ جہاد کی کال دی گئی بلکہ ہر ایک نے اپنی اپنی جنگ لڑی یا حملہ آوروں سے سودابازی کی۔ صلیبیوں کا مقابلہ فاطمی، زنگی، ایوبی اور ممالیک سلاطین نے اپنی ذاتی حیثیت میں کیا۔ عالم اسلام کے کسی اور سلطان یا بادشاہ نے آکر ان کی مدد نہیں کی۔ یہاں تک کہ عباسی خلیفہ بغداد نے جو کہ شام سے اور صلیبی مقبوضات سے زیادہ دور بھی نہ تھا، ایک مرتبہ بھی جہاد کی کال نہیں دی اور نہ ہی خود اس جہاد میں حصہ لینے کے لیے آگے بڑھا۔ عمادالدین زنگی، نورالدین زنگی، صلاح الدین ایوبی، اس کے جانشین اور ممالیک سلاطین سب نے شام ومصر کے فرمانرواؤں کی حیثیت سے اپنی سرزمین پر بیرونی حملہ آوروں کا دفاع کیا اور بالآخر کامیابی حاصل کی۔ صلیبی یلغار کو نہ تو عالم اسلام پر حملہ سمجھا گیا اور نہ اندلس سے ہندوستان تک پھیلے ہوئے کروڑوں مسلمانوں میں سے خلیفہ سمیت کسی نے اس جہاد میں حصہ

لینے کے لیے گھر بار چھوڑا۔

تاتاری یلغار کی صورت تو اور بھی مختلف تھی۔ یہاں تو خود عباسی خلیفہ بغداد ناصرالدین اللہ نے محمد خوارزم شاہ سے عداوت کی بنا پر خود چنگیز خان کو محمد خوارزم شاہ پر حملے کی دعوت دی۔ کسی سلطان نے محمد خوارزم کی مدد نہ کی۔ یہاں تک کہ وہ پسپا ہوتے ہوئے تاتاریوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کے بیٹے جلال الدین خوارزم شاہ کا بھی کسی نے ساتھ نہ دیا۔ وہ پسپا ہوتا ہوا ہندوستان کی طرف آیا۔ مگر یہاں ملتان و سندھ کے سلطان ناصرالدین قباچہ اور دہلی کے سلطان التمش نے اسے پناہ دینا یا حمایت تو درکنار بلکہ اس سے بعض جگہوں پر جنگ کی چنانچہ وہ بے نیل و مرام واپس چلا گیا اور کچھ عرصہ بعد آذربائیجان میں تاتاریوں کی مزاحمت کرتے ہوئے مارا گیا۔ عمومی مسلمانوں کی صورتحال یہ تھی کہ ماوراالنہر، خراسان اور فارس میں فرقہ واریت حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ اشعری، حنبلی، شافعی، شیعہ وسنی دست و گریباں تھے۔ جس شہر پر تاتاری حملہ آور ہوتے، وہاں کوئی ایک فرقہ تاتاری امان کی یقین دہانی پر شہر کے دروازے کھول دیتا اور پھر اس فرقہ سمیت سب لوگ ہلاک یا برباد کردیئے جاتے تھے۔ کسی جگہ سے جہاد کی آواز بلند نہ ہوئی بلکہ مسلمانوں نے تاتاری فوج میں بھرتی ہونا شروع کردیا اور جب ہلاکو خاں بغداد میں داخل ہوا اور سقوط بغداد ہوا تو تاتاری فوج میں بہت بڑی تعداد مسلمانوں کی تھی۔

چنانچہ مسلمانوں کے دور عروج میں ہر سلطان اور ہر فرد نے اپنی اپنی جنگ لڑی ہے جیسی کہ کسی بھی حکمران یا کسی بھی علاقے کے لوگ لڑتے تھے۔ خواہ وہ دفاع کے لیے ہوتی تھی یا سلطنت کی توسیع کے لیے۔ جس قسم کے جہاد کی دعوت اور نمونہ سید احمد بریلوی سے لے کر طالبان اور اسامہ بن لادن تک گزشتہ ڈیڑھ دو سو برس میں پیش کیا گیا اور مسلمانوں کے لیے فائدے سے زیادہ نقصان کا باعث ہوا، اس کی تاریخ میں سوائے خوارج اور قرامطہ اور اسی قسم کے داعیوں کے اور کوئی مثال نہیں ملتی اور ان کے بارے میں ابن خلدون کی متذکرہ بالا رائے سب سے صائب معلوم ہوتی ہے۔

4- دورعروج کے مسلمانوں کا ذاتی کردار

چوتھا تاریخی مغالطہ یہ پھیلایا جاتا ہے کہ دورعروج کے مسلمان حکمرانوں اور سپہ سالاروں کو مبراعن الخطاء پیغمبرانہ صفات کے حامل کردار کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اگر آج کے مسلمان ویسا کردار اپنا لیں تو سارے مسائل حل ہوجائیں گے۔ اسلامی احیا کے علمبردار مذہبی رہنماؤں نے یہ منطق اس لئے پیش کی کہ موروثی جاگیری سلطنتوں کے زوال کے ساتھ ہی ملاؤں کا بھی زوال ہوگیا تھا جو ان سلطنتوں میں ایک کل پرزے کی حیثیت سے اقتدار میں شریک رہے تھے وہ اب اسلامی احیاء کے نام پر اپنے اس اقتدار کی بحالی چاہتے تھے۔

اگر اپنی تاریخ کا مطالعہ مذہبی لٹریچر کے طور پر نہ کیا جائے اور تاریخ کے کرداروں کا انسان سمجھ کر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ بھی انسانوں کی طرح خوبیوں اور عیوب دونوں کے حامل تھے اور آج کا مسلمان کردار کے اعتبار سے ان سے خاص مختلف نہیں ہے۔ آج کے احیاء پسند مورخین صرف خوبیوں کا ذکر کرتے ہیں عیوب کوئی نہیں بتاتا اور پھر آج کل کے عام مسلمانوں کو مطعون کیا جاتا ہے کہ وہ بدکردار ہوگئے ہیں اور اسلئے تمام مصیبتیں مسلمانوں پر ٹوٹ پڑی ہیں۔ لیکن قرون وسطیٰ کے مسلمان مؤرخین طبری، ابن اثیر، ابن خلدون، بلاذری، یعقوبی، ابن کثیر، سیوطی وغیرہ کو سلام کہ انہوں نے دورعروج کے سلاطین اور بادشاہوں کے عام حکمران اور عام انسان کے طور پر خوبیاں اور عیب سب کھول کر بیان کیے ہیں۔ ان کے مطابق بغداد کے قاضیوں نے شراب کو حلال قرار دے رکھا تھا۔ شراب و رقص و سرور بیشتر اموی، عباسی، فاطمی، اندلسی، عثمانی خلیفے اور غزنوی، غوری، سلجوقی، خوارزم شاہی، صفوی اور مغل شہنشاہوں کے درباروں کا خاصہ تھے۔ یہاں تک کہ ان میں سے بعض خلیفے، سلاطین اور شہنشاہ کثرت شراب نوشی سے وفات پا گئے۔

قرون وسطیٰ کے مسلمان مؤرخین نے مسلمان حکمران طبقوں کی باہمی سیاسی کشمکش، سیاسی رقابت، قتل و غارت اور استبدادیت، عیاشی، شراب نوشی، لواطت و دیگر شرعی عیوب

بے لاگ ہوکر لکھ ڈالے ہیں اور کبھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ انہوں نے اسلام کے عہد زریں پر کیچڑ اچھالا یا کردار کشی کی ہے یا ان کی تحریریں خلاف اسلام ہیں۔ اگر ان مؤرخین کے بیانات میں حکمرانوں کے اعمال و افعال اور کردار کو دیکھیں تو اس میں دینداری، آٹے میں نمک کے برابر نظر آئے گی ۔چند استثنیات کو چھوڑ کر بیشتر بادشاہ ،شہنشاہ اور سلاطین کسی نہ کسی شرعی عیب کا شکار ضرور رہے ہیں۔ بیشتر شراب نوشی کرتے تھے ۔رقص وسرور کی محفلیں جماتے تھے ۔کنیزوں اور لونڈیوں سے حرم بھرے رکھتے تھے ۔بعض کو لواطت کی لت بھی تھی۔ ان تمام ذاتی شرعی عیوب کے باوجود علمائے دین ان حکمرانوں کا نام خطبہ میں پڑھتے تھے اور ان کی اطاعت اور احترام کو واجب گردانتے تھے۔ بادشاہ ان کو وظیفے، تنخواہیں اور انعامات دیتے تھے۔ عدلیہ اور درس و تدریس کے شعبے انہی علمائے دین کے پاس ہوتے تھے اور یوں وہ اس مروجہ استبدادی موروثی حکومتی ڈھانچے میں ایک کل پرزے کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔کبھی کسی نے اس دستور حکومت کو غیر اسلامی قرار نہیں دیا تھا اور نہ ہی ''اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات'' کے نفاذ کی کوئی تحریک کسی نے چلائی تھی۔

19 ویں اور 20 ویں صدی میں مسلمانوں کی موروثی جاگیری سلطنتوں کے زوال کے دوران اور اس کے بعد اسلامی احیاء کی تحریکوں نے جنم لیا اور یہ کہا جانے لگا کہ ماضی میں مسلمانوں کا عروج اس وجہ سے تھا کہ اس وقت کے مسلمان حکمران اور ان کے درباری اور ان کی مسلمان رعایا سب اسلامی تعلیمات پر سختی سے عمل پیرا تھے۔ اسلامی نظام کا دور دورہ تھا۔ اسلامی اتحاد و بھائی چارہ ان کے دلوں میں جاگزیں تھا۔ وہ علاقائی، لسانی، قبائلی اور رنگ ونسل کے امتیازات سے بالاتر تھے اور وہ لالچ، طمع، ہوس اقتدار اور ہوس مال و زر سے مبرا تھے۔ وہ عیش پرستی، لہوولعب، جھوٹ، مکروفریب، دھوکہ دہی اور ریاکاری اور دیگر گناہوں سے بہت دور تھے۔ ان کی زندگیاں اسلامی تعلیمات کا عملی نمونہ تھیں وغیرہ وغیرہ۔ اور اب جب مسلمان اسلامی تعلیمات، اسلامی نظام، اسلامی اتحاد سے دور ہوگئے اور علاقائی، لسانی، قبائلی تفریق و امتیاز کا شکار ہوگئے، عیش پرستی، لہوولعب اور گناہ پرستی میں مبتلا ہوگئے تو زوال نے ان کو آلیا اور یہ دنیا میں پست اور کمزور ہوکر ذلیل و خوار ہوگئے، وغیرہ وغیرہ۔

اسلامی احیاء کے علمبردار مذہبی رہنماؤں نے یہ منطق اس لیے پیش کی کہ موروثی جاگیری سلطنتوں کے زوال کے ساتھ ہی ملاؤں کا بھی زوال ہوگیا تھا جو ان سلطنتوں میں ایک کل پرزے کی حیثیت سے اقتدار میں شریک رہے تھے۔ وہ اب اسلامی احیاء کے نام پر اپنے اس اقتدار کی بحالی چاہتے تھے اور اپنی لیڈری چمکا کر کاروبار زندگی چلانے کا بندوبست کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنے مادی مفاد کی خاطر تاریخ کو مذہبی عقیدہ کے ساتھ جوڑ دیا اور دورعروج کا نقشہ مذہب کی بنیاد پر استوار کر کے پیش کیا۔

اسلامی احیاء پسندوں نے تاریخ نویسی کا ایک نیا ڈھنگ اختیار کیا جو ماضی کے مؤرخین سے قطعی مختلف تھا۔ انہوں نے دورعروج کی اس تاریخ کو ''اسلامی تاریخ'' یا ''تاریخ اسلام'' کا نام دے دیا۔ 19 ویں اور 20 ویں صدی میں ملاؤں نے تاریخ پر یہ ملمع کاری کی اور اسے مذہبی لٹریچر بنا دیا۔ زوال پذیر جاگیردار طبقہ نے ان کی سرپرستی کی اور پھر جہاں کہیں اس کے مفاد میں تھا، مغربی سامراج نے بھی ان کی سرپرستی کی۔ ان احیاء پسندوں نے قرون وسطیٰ کے بادشاہوں اور سپہ سالاروں کو اسلامی ہیرو بنا کر پیش کیا۔ انہوں نے مسلمانوں کے نیم تعلیم یافتہ درمیانے طبقے کے نوجوانوں کو عارضہ یادایام (Nostalgia) میں مبتلا کر دیا اور ماضی پرستی میں تقدس اور تحریم کے پہلوؤں کو بھی شامل کر دیا۔ برصغیر میں انیسویں صدی کے وسط میں احیاء پسندوں کے مراکز ندوہ اور دیوبند سے یہ سلسلہ شروع ہوا جو شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، ابوکلام آزاد سے ہوتا ہوا سید ابوالاعلیٰ مودودی تک پہنچا۔ پھر اس ''اسلامی تاریخ'' کے نام پر ناول نگاری نے ملمع کاری کی اور ''اسلامی تاریخی ناول'' لکھے گئے جن کا سلسلہ رئیس احمد جعفری، نسیم حجازی، ایم۔ اسلم وغیرہ تک پہنچا۔ انہوں نے عارضہ یاد ایام میں مذہبی جنون کی آمیزش کی اور عام سادہ لوح نیم پڑھا لکھا مسلمان ان ''اسلامی ہیروز'' کو مذہبی دیوتا سمجھنے لگا۔ احیاء پسند مسلمان شاعر بھی اس معاملے میں پیچھے نہ رہے۔ بالخصوص علامہ اقبال نے ماضی پرستی اور اسلامی احیاء کے حوالے سے ایسی موثر شاعری کی کہ کئی نسلوں کو عارضہ یادایام (Nostalgia) میں مبتلا کر دیا۔ غالباً برصغیر میں ہندو۔ مسلم تضاد کی شدت اس کی متقاضی تھی۔ ہندو احیاء پسند جس طریقے سے برصغیر کی

تاریخ کو مذہب سے وابستہ کر کے یہاں کے ازمنہ قدیم اور قرون وسطیٰ کے راجاؤں کو مذہبی تقدس دے کر مذہبی ہیرو اور نیشنل ہیرو بنا کر پیش کر رہے تھے، اس کے جواب میں مسلمان بھی ایسا کرنے پر مجبور ہوئے۔ لیکن ماضی پرستی کی یہ لہر برصغیر کے مسلمان عوام الناس کے مسائل حل نہ کر سکی۔ ان کے مسائل جدت پسندی کی لہر نے حل کیے جس کا آغاز سرسید احمد خان، سید امیر علی اور نواب لطیف نے کیا اور محمد علی جناح نے انجام تک پہنچایا۔ علی گڑھ تحریک اور جدت پسندی کی دوسری تحریکوں نے مسلمانوں کے پاؤں میں پڑی ماضی کی بوجھل بیڑیاں کاٹنے کی کوشش کی اور انہیں عہد حاضر کے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے اور مستقبل میں زقند لگانے کا راستہ دکھایا۔ سرسید نے موروثی جاگیری حکمرانوں پر کڑی تنقید کی۔ سید امیر علی نے مسلمانوں کے دور عروج کی تاریخ لکھی مگر اس کا نام ''اسلامی تاریخ'' یا ''تاریخ اسلام'' رکھنے کے بجائے ''سرسانیوں کی تاریخ'' (History of Saracens) رکھا۔ مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی تصنیف ''دربار اکبری'' میں اکبر کے سنہرے دور پر احیاء پسندوں کی جانب سے کیے گئے حملوں کا بھرپور جواب دیا اور تاریخ کو عقیدہ سے جدا کر کے پیش کیا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ قرون وسطیٰ کے مسلمان مؤرخین، جنہوں نے اپنے عہد میں تاریخ نویسی کے علم اور فن کو بے لاگ حقائق نویسی کے کمال تک پہنچا دیا اور ہیروڈوٹس اور جوزفس کی تاریخ نویسی کی قدیم روایت کو بام عروج تک پہنچایا، انہوں نے تاریخ کو عقیدے، مذہب یا دین سے کبھی وابستہ نہیں کیا۔ وہ خلیفوں، بادشاہوں، وزیروں اور سپہ سالاروں کو مروجہ موروثی جاگیری نظام سیاست اور قرون وسطیٰ کی تسلیم شدہ مروجہ اخلاقیات کی عینک سے دیکھتے تھے، عقیدہ اور مذہب کا محدب عدسہ استعمال نہیں کرتے تھے۔ کسی نے بھی اپنی تصنیف کو ''تاریخ اسلام'' یا ''اسلامی تاریخ'' نہیں کہا۔ امام المورخین علامہ محمد ابن جریر طبری نے اپنی تصنیف کا نام ''تاریخ الامم والملوک'' یعنی قوموں اور بادشاہوں کی تاریخ رکھا۔ بلاذری نے صرف فتوحات کا حال قلمبند کیا اور نام ''فتوح البلدان'' یعنی ''ملکوں کی فتوحات'' رکھا۔ ''اسلامی فتوحات'' نہیں رکھا۔ مسعودی نے اپنی تصنیف کا نام ''مروج

الذہب و معادن الجوہر فی التاریخ'' یعنی ''تاریخ میں سونے و معادنی ذخائر کے میدان اور جواہر کی کان'' رکھا۔ ابن اثیر نے اپنی ضخیم تصنیف کا نام ''الکامل فی التاریخ'' یعنی ''مکمل تاریخ'' رکھا ہے۔ ابن خلدون کی تاریخ کا نام ''العبر والدیوان المبتداء والخبر فی ایام العرب والعجم والبربر'' یعنی ''عرب و عجم و بربر کے حالات پر مجموعہ نصیحت و عبرت اور دیوان مبتداؤ خبر'' رکھا ہے۔ ابوالفدا ابن کثیر کی تاریخ کی کتاب کا نام ''البدایہ والنہایہ'' یعنی ''آغاز و انجام'' ہے۔ جلال الدین سیوطی نے اپنی تصنیف کا نام ''تاریخ الخلفاء'' رکھا۔ علامہ شہرستانی کی کتاب ''ملل و النحل'' تمام فرقوں کی تاریخ بیان کرتی ہے۔ اندلس اور مراکش کے مؤرخ علامہ مقری کی کتاب کا نام ''نفح الطیب'' یعنی ''خوشبو کی لپٹ'' ہے۔ محمد ابن سعد، جو معروف مورخ واقدی کا کاتب تھا، کی تصنیف کا نام ''طبقات الکبیر'' یا ''الطبقات الکبریٰ'' ہے جو عام طور سے ''طبقات ابن سعد'' کہلاتی ہے۔ واقدی کی اپنی کتاب ''المغازی النبویہ'' یعنی ''غزوات نبوی'' کے نام سے موسوم کی گئی ہے۔ احمد بن علی الخطیب کی کتاب ''تاریخ بغداد'' کے نام سے موسوم ہے جبکہ ابن عساکر کی کتاب ''تاریخ الکبیر'' یا ''تاریخ دمشق الکبیر'' کہلاتی ہے۔ ابن مسکویہ نے اپنی تصنیف کا نام ''تجاریب الامم'' یعنی ''قوموں کے تجربات'' رکھا۔ ابن خلکان کی مشہور تصنیف ''وفیات الاعیان'' کے نام سے موسوم ہے جس کا مفہوم ہے ''مشاہیر کے سوانحی خاکے''۔ یہ صرف چند اہم تصانیف کے نام ہیں جو قرون وسطیٰ کے مسلمان حکمرانوں کے بارے میں مستند ترین مآخذ کی حیثیت سے متفق علیہ تسلیم کی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ جتنی بھی معروف تواریخ قرون وسطیٰ میں لکھی گئی ہیں ان میں سے کسی تاریخ کے نام کے ساتھ ''اسلام'' یا ''اسلامی'' کی اضافت نہیں لگائی گئی۔ اس لیے کہ وہ مؤرخین بجا طور پر تاریخ کو عقیدہ یا دین سے الگ سمجھتے تھے کیونکہ واقعتاً ایسا ہی تھا۔ وہ کسی حاکم یا وزیر یا امیر یا سپہ سالار کو اسلام کا ہیرو بنا کر پیش نہ کرتے تھے۔ البتہ جو شخصیات حقیقتاً تقویٰ و پرہیز گاری اور دینداری میں شہرت کی حامل ہوتی تھیں تو ان کا تذکرہ اس حوالہ سے ضرور کیا جاتا تھا۔ لیکن شاذ ہی کسی حاکم یا بااقتدار شخص کا دین کے حوالے سے ذکر ملتا ہے۔

قرون وسطیٰ کے مسلمان مورخین نے دراصل بے لاگ سیاسی تاریخ لکھی ہے اور

جو کچھ ہوا وہ بلا روک ٹوک لکھ دیا۔ چونکہ ہم عصر سیاست میں اس وقت وہ سب کچھ جائز اور روا سمجھا جاتا تھا جو استبداد کے ذریعے اقتدار حاصل کرنے اور اسے مستحکم کرنے کے لیے کیا جاتا تھا۔اس لیے یہ مورخین ان حقائق کے بیان پر کوئی معذرت خواہانہ رویہ بھی اختیار نہیں کرتے۔ دنیا کی مروجہ اخلاقیات کسی دوسرے سیاسی یا اخلاقی نظام سے واقف ہی نہیں تھی۔ آج مسلمان احیاء پسند مؤرخین کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ تاریخ کا وہ بہت بڑا حصہ بیان ہی نہ کیا جائے جسے آج کے زمانے میں rationalise نہیں کہا جا سکتا یا پھر وہ معذرت خواہانہ رویہ اختیار کر کے توجیہات بیان کرتے ہیں۔ وہ صرف چند ایسے واقعات کو پھیلا کر بیان کرتے ہیں جن سے وہ حکمران فرشتہ سیرت ثابت ہوسکیں یا پھر غیر مسلموں پر ان کے غلبے اور فتوحات کی تفصیل میں مذہبی جوش وجنون شامل کر کے بیان کرتے ہیں جس سے ثابت ہو کہ نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی ان کا مقصد تھا نہ ملک گیری، وہ تو بس اسلام اور دین کی سربلندی کی خاطر حملہ آور ہوئے اور اپنی اسلامی سیرت و کردار کی بدولت فتح یاب ہوئے اور انہوں نے غلبہ پانے کے بعد مفتوح غیر مسلموں پر کوئی ظلم نہیں کیا، انہیں تاخت وتاراج نہیں کیا، ان کا مال و اسباب نہیں لوٹا، ان کی عورتیں اور بچے لونڈی غلام نہیں بنائے وغیرہ وغیرہ۔قرون وسطیٰ کا کوئی مورخ ان حکمرانوں کو اس انداز میں پیش نہیں کرتا اور نہ ان کے سیرت و کردار کو اسلامی بنا کر بیان کرتا ہے اور نہ ہی غیر مسلم مفتوحین پر ان کے ظلم و جور پر کوئی معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرتا ہے۔ کیونکہ یہ سب کچھ اس وقت کی مروجہ استبدادی سیاست میں جائز وروا سمجھا جاتا تھا۔مسلمان مفتوحین کے ساتھ بھی استبدادیت کا مظاہرہ کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی جاتی تھی۔

اسلامی احیاء پسند، دنیا میں صنعتی انقلاب کے بعد گزشتہ ڈیڑھ دوسو سال میں آنے والی عظیم سیاسی ومعاشی واخلاقی تبدیلیوں سے چشم پوشی کر کے اپنے خوابوں میں قرون وسطیٰ کی اسی استبدادیت کی دنیا میں واپس لوٹنا چاہتا ہے اور مسلمانوں کو دنیا پر پھر سے چھا جانے کا وہی راستہ سجھاتا ہے جس پر وہ لوگ اس وقت چل رہے تھے۔ وہ ایک تصوراتی مردمومن کا احیاء چاہتا ہے جس کے بارے میں اس کا خیال ہے کہ ''لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی

امامت کا''۔ وہ دین کو سیاست سے الگ کرنے کو چنگیزی قرار دیتا ہے جبکہ قرون وسطیٰ میں صرف چنگیز خاں ہی نہیں بلکہ تمام مسلم وغیر مسلم فرمانروا اسی ہم عصر استبدادی سیاست پر عمل پیرا تھے جس میں دین سیاست سے الگ تھا۔ ان میں سے کوئی فرمانروا دین کو بنیاد بنا کر سیاست یا حکومت نہیں کرتا تھا۔ اسلامی احیاء پسند ماضی کے استبدادی، فرسودہ اور مردہ نظام کو جو آج اپنی relevance قطعی طور پر کھو چکا ہے، قرون وسطیٰ سے چھلانگ لگوا کر آج کے دور میں لاگو کرنا چاہتا ہے جبکہ اس کا ناممکن العمل ہونا کئی بار ثابت ہو چکا ہے۔ جہاں تک دینداری کا تعلق ہے تو قرون وسطیٰ میں جس قدر دیندار اور پرہیزگار لوگ موجود تھے، اس حساب سے آج بھی ان کی کمی نہیں ہے۔ عروج کا تعلق دینداری کے ساتھ اور زوال کا تعلق بے دینی کے ساتھ نہ تھا اور نہ ہے۔ ہم گزشتہ ڈیڑھ دو سو برس سے اسلامی احیاء پسندوں کے عارضہ یادایام میں مبتلا ہو کر اپنے کردار و عمل کو اسلامی بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں لیکن دوسری اقوام کے مقابلے میں ہماری حالت زار میں بہتری کے بجائے بدتری پیدا ہوئی ہے۔ جو تھوڑی بہت بہتری پیدا بھی ہوئی وہ ماضی پرستی اور احیاء پسندی کے بجائے جدت پسندوں کی عہد حاضر سے ہم آہنگی کی تحریک کی بدولت ہوئی ہے۔ برصغیر کے کیس میں سرسید کی علی گڑھ تحریک اور پھر محمد علی جناح کی قیام پاکستان کی تحریک جدت پسندی کی تحریکیں تھیں جن کا برصغیر کے مسلم عوام الناس کو بے حد فائدہ پہنچا۔ بعدازاں پاکستان کے حکمرانوں نے اپنے استبدادی اقتدار کے قیام، دوام اور استحکام کی خاطر اسلامی احیاء پسندی کا سہارا لیا جس سے یہ ملک تنزل کا شکار ہوا اور بدستور روبہ تنزل ہے۔

مسلمانوں کی سیاسی تاریخ کا مطالعہ بطور انسانی تاریخ کیا جائے اور جو حکمران یا طبقات یا امراء، وزراء اور خلفاء اقتدار کی رسہ کشی میں ملوث رہے ان کو انسان سمجھا جائے جیسا کہ قرون وسطیٰ کے مؤرخین انہیں سمجھتے تھے تو پھر آج کے مسلمان اپنا قبلہ درست کر سکتے ہیں۔ وہ ایک تصوراتی ماضی کی سمت دیکھنے کے بجائے اپنے حال اور مستقبل کی ٹھوس حقیقت پر توجہ دیں گے۔ ایک تصوراتی ہیولے کے پیچھے دوڑنے کے بجائے کسی حقیقی منزل کا تعین کر سکیں گے۔ ہم عارضہء یادایام سے نجات حاصل کر کے عہد حاضر کے تقاضوں سے عہدہ

برآ ہونے کے قابل ہوسکیں گے۔قرون وسطیٰ کے حکمران اپنے ہم عصر مادی تقاضوں پر جس خوبی اور عمدگی سے عمل پیرا ہوتے تھے اسی کمال کے ساتھ ان کا عروج بھی قائم ہوتا تھا۔ وہ دین اور سیاست کو باہم ملوث کیے بغیر ہم عصر مروجہ استبدادی نظام حکومت پر بغیر کسی ''اسلامی'' یا ''غیراسلامی'' کی بحث میں الجھے عمل کرتے تھے۔ ہم آج اپنے مادی عصری تقاضوں سے نمٹنے بلکہ انہیں سمجھنے سے بھی قاصر ہیں۔ ملاؤں نے دین اور سیاست کو اور عقیدہ اور تاریخ کو باہم ملوث کر کے معاشرے میں وحشت ناک فرقہ واریت کا زہر گھول دیا ہے۔ آج جبکہ یورپ کے صنعتی انقلاب نے دنیا میں قرون وسطیٰ کی تمام اقدار بدل کر رکھ دی ہیں، ہمیں قرون وسطیٰ کی جاگیردارانہ موروثی سیاست کے خاتمے، طبقاتی سماج، معاشرتی ناہمواری اور جاگیردارانہ قدروں کے خاتمے، دقیانوسیت اور کٹھ ملائیت کے شکنجے سے نجات حاصل کرنا ہوگی۔عصر جدید کے جمہوری تقاضوں کی تکمیل، سرکاری وغیرسرکاری ہر سطح پر جمہوری اداروں کی تشکیل نو، بنیادی انسانی حقوق اور فکری آزادی کی ضمانت، جدت فکر اور ذہنوں پر مسلط عقیدوں کے شکنجوں سے آزادی، سائنسی افکار اور جدید علوم وفنون کے ہر شعبہ زندگی میں اطلاق کا نصب العین ہی 21ویں صدی کی دنیا میں ہمارے لیے ترقی کی گنجائش پیدا کرسکتا ہے۔ انہی بنیادوں پر نئے ریاستی، سیاسی وحکومتی ڈھانچے کی تنظیم نو کی جا سکتی ہے اور governance کے جدید طریقے اختیار کیے جا سکتے ہیں۔ قرون وسطیٰ کے خلیفہ، بادشاہ، امراء، وزرا، سپہ سالار اور مجاہدین کے دور کا احیاء ہمیں مزید پس ماندگی اور ذلت کی جانب دھکیل دے گا۔

خلاصہء کلام اس مقالے کا یہ ہے کہ

اسلامی نظام حکومت کی اصطلاح ایک تجریدی اصطلاح ہے۔ نظام حکومت انسان کے تہذیبی ارتقاء سے جنم لیتے ہیں اور مسلمان اپنے عروج کی تاریخ میں اپنے عہد کے مروّجہ نظام ہائے حکومت یعنی پہلے تو قبائلی جمہوریت اور پھر ملوکیت کے نظاموں پر عمل کرتے رہے۔مگر جب صنعتی انقلاب نے جدید جمہوری نظاموں کو جنم دیا تو مسلمان ان نظاموں سے ہم آہنگ ہونے کے بجائے قرون وسطیٰ کے نظاموں اور افکار کو مذہبی تقدس دے کر اُن سے

چمٹے رہے اور بدستور چمٹے ہوئے ہیں کیونکہ ابھی تک مسلمان معاشرے بھرپور صنعتی انقلاب سے دوچار نہیں ہوئے۔ اسلامی نظام حکومت کے نام سے ہمارے سامنے تین ماڈل ہیں۔(1) سعودی عرب کا ماڈل جو قرون وسطیٰ کے خاندانی موروثی نظام حکومت کا ماڈل ہے۔(2) افغانستان میں طالبان کا ماڈل جو قرون اولیٰ کے جزیرہ نما عرب کے قبائلی نظام حکومت کے مطابق بنانے کی ناکام کوشش تھا۔(3) ایران کی ولایت فقیہ کا ماڈل ہے جو اگرچہ خاندانی موروثی شہنشاہیت تو نہیں لیکن علماء کی آمریت نے اسے قرون وسطیٰ کی ملوکیت سے قریب تر رکھا ہوا ہے۔ بقیہ تمام مسلمان ممالک فوجی یا نیم فوجی آمریتوں کے ماتحت ہیں اور قرون وسطیٰ کی ملوکیت سے قریب تر ہیں۔ یہ تمام ماڈل 21 ویں صدی کے جدید تقاضے پورے کرنے سے قاصر ہیں۔

اسلامی اتحاد واخوت کی بنیاد پر مسلم اُمہّ کا تصور بھی تجریدی تصور ہے۔ دنیا میں مفادات کے حوالے سے اتحاد بنتے اور بگڑتے ہیں۔ اس وقت امریکی سامراج اپنے حلیف ممالک کے مسلم وغیر مسلم حکمرانوں کی مدد سے ساری دنیا پر بالعموم اور مسلم خطے پر بالخصوص یلغار کیے ہوئے ہے اور مسلم عوام الناس کا جو قتل عام کر رہا ہے اس پر پوری دنیا کے عوام کی اکثریت خواہ وہ غیر مسلم ہوں یا مسلم، شدید غم و غصے کی کیفیت سے دوچار ہے۔ بلکہ غیر مسلم عوام کا احتجاج زیادہ پُرجوش نظر آتا ہے اور وہ مسلم عوام الناس کے فطری اتحادی ہیں کہ وہ بھی امریکی وحشیانہ عزائم سے خائف نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ایک مشترکہ ظالم کے خلاف دنیا کے تمام مظلوموں کا، بلا لحاظ مذہب وفرقہ، اتحاد کسی حد تک نتیجہ خیز ثابت ہوسکتا ہے۔

اسلامی جہاد کے نام پر دکان چمکانے اور سادہ لوح مسلمانوں کو دور دراز قومی آزادی کی جنگوں میں حصہ لینے بھیجنے کے بجائے اپنے اپنے ملکوں میں پریشر گروپ بنائے جائیں تو عالمی سامراج کی اس عالمی دہشت گردی کا مقابلہ دنیا بھر کے امن پسند عوام کے وسیع تر جہاد کے ذریعہ ہوسکتا ہے۔

جہاں تک کردار کو زیادہ سے زیادہ ''اسلامی'' بنانے کا تعلق ہے تو آج کے مسلمانوں میں اچھے کردار کے حامل افراد کا تناسب ماضی کے مسلمانوں میں اچھے ''اسلامی''

کردار رکھنے والوں کے تناسب سے کم نہیں ہے۔جس طرح آج اچھے بُرے ہر طرح کے کردار کے لوگ پائے جاتے ہیں، ویسے ہی ماضی میں بھی پائے جاتے تھے۔اس قسم کے ''نان ایشوز'' پر وقت اور توانائی ضائع کرنے کے بجائے ہمیں تاریخی مغالطوں پر مبنی تصوراتی دنیا کے خول کو توڑ کر باہر نکلنا ہوگا اور عارضہ یادایام(Nostalgia) سے نجات پانی ہوگی۔ اکیسویں صدی کے مسلمان نے اکیسویں صدی میں سر اُٹھا کر جینا ہے تو خیالی تاریخ کی بھول بھلیوں سے نکل کر حقیقی دنیا کے جدید تقاضے پورے کرنے ہوں گے۔

حواشی

(1) W. W. Hunter, *The Indian Musalmans*, 1871 Reprinted by The Premier Book House, Lahore, 1974, p. 11

(2) تفصیل کے لیے دیکھئے ۔زاہد چودھری/حسن جعفرزیدی۔پاکستان کی سیاسی تاریخ۔ جلد 8۔افغانستان کا تاریخی پس منظر اور مسئلہ پختونستان کا آغاز۔ادارہ مطالعہ تاریخ۔لاہور۔ 1994۔ص ص 26-27

(3) سید ابوالاعلیٰ مودودی۔تجدید واحیائے دین۔اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔لاہور۔ 1963 ص 128

(4) زاہد چودھری/حسن جعفرزیدی۔محولہ بالا۔ص 28

(5) تفصیل کے لیے دیکھئے ۔زاہد چودھری/حسن جعفرزیدی۔پاکستان کی سیاسی تاریخ۔ جلد 5 ۔ مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقاء۔ادارہ مطالعہ تاریخ۔لاہور۔199 ۔ص 70-72

(6) (i) ابن ہشام۔سیرۃ النبی کامل۔ترجمہ وتہذیب۔مولانا عبدالجلیل صدیقی، مولانا غلام رسول مہر۔شیخ غلام علی اینڈ سنز۔لاہور۔حصہ اوّل۔ص۔138 150140-150151-158159

(ii) ابی جعفر محمد بن جریر طبری۔تاریخ الأمم والملوک (تاریخ طبری)۔ترجمہ سید محمد ابراہیم ندوی ۔نفیس اکیڈمی۔کراچی۔حصہ اوّل۔1970۔ص ص 36-43

(7) علامہ احمد امین (مصری)۔فجرالاسلام۔ادارہ طلوع اسلام۔لاہور 1967ء۔ص 637، 639، 643

(8) قُرآن مجید کی سورۃ مبارکہ الفتح کی آیت 10 اور آیت 18 میں اللہ تعالیٰ نے بیعت رضوان کرنے والوں کی بے حد تعریف وتوصیف فرمائی ہے اور سورۃ مبارکہ ممتحنہ کی آیت 12 میں آنحضرت ﷺ کے عورتوں سے بیعت لینے کی شرائط بیان فرمائی گئی ہیں۔تاہم ان آیات سے بھی یہی اشارہ ملتا ہے کہ بیعت کا طریقہ اسوقت کے عربوں میں پہلے سے معروف تھا۔صرف شرائط ہر موقع کی مناسبت سے طے ہوتی تھیں۔

(9) علامہ احمد امین (مصری)۔محولہ بالا۔ص 667

(10) اُردو دائرہ معارف اسلامی۔دانش گاہ پنجاب۔لاہور۔طبع اوّل۔1971ء۔جلد 5۔ص 291

(11) ابن خلدون، علامہ عبدالرحمن۔مقدمہ ابن خلدون۔ترجمہ سعد حسن خان یوسفی۔اصح الطابع وکارخانہ تجارت۔کراچی۔ص ص 191-192، 386

(12) Frederick Engels, *Origins of Family, Private Property &*

State:Selected Works, Karl Marx and Frederick Engels, Progress Publishers, Moscow, 1970, Vol. 3, pp. 263-265

(13) ابن خلدون۔محولہ بالا۔ص 233

(14) محمد حنیف ندوی۔افکار ابن خلدون۔ادارہ ثقافت اسلامیہ۔لاہور۔1969۔ص ص 62-63

(15) علامہ احمد امین (مصری)۔محولہ بالا۔ص 373

(16) ابن خلدون۔محولہ بالا۔ص ص232-233

(17) ابن خلدون۔محولہ بالا۔ص ص199-200

(18) علامہ احمد امین (مصری)۔محولہ بالا۔ص 261-262

(19) تفصیل کے لیے دیکھئے زاہد چودھری/حسن جعفر زیدی/ خالد محبوب ۔مسلمانوں کی سیاسی تاریخ۔ عہد بنوامیہ۔ادارہ مطالعہ تاریخ۔لاہور۔199۔ص-70

(20) تفصیل کے لیے دیکھئے زاہد چودھری/حسن جعفر زیدی ۔مسلمانوں کی سیاسی تاریخ۔ عہد بنوعباس۔ادارہ مطالعہ تاریخ۔لاہور۔ 2003ء

(21) اسٹینلے لین پول۔ سلاطین ترکیہ ۔ ترجمہ۔نصیب اختر۔ایچ۔ایم ۔سعید اینڈ کمپنی۔کراچی۔ 1966۔ص357

(22) مقبول بیگ بدخشانی۔تاریخ ایران۔مجلس ترقی ادب۔لاہور۔1971ء۔جلد دوم ۔ص 342

(23) علامہ احمد امین (مصری)۔محولہ بالا۔ص ص 43-744

(24) ایضاً۔ص ص 741، 724-725

(25) ایضاً۔ص 734

(26) زاہد چودھری/حسن جعفر زیدی۔مسلمانوں کی سیاسی تاریخ۔ عہد بنو عباس۔ادارہ مطالعہ تاریخ۔لاہور۔ 2003۔جلد۔ا۔ص 312

(27) ابن خلدون،محولہ بالا۔ص 188

آراء

حمید اختر

زیدی صاحب کا مقالہ بہت جامع، بہت طویل ہے لیکن چونکہ مغالطوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ یہ مقالہ بھی ناکافی نظر آتا ہے اور اس معاملے پر اگر زیادہ سنجیدگی سے کام کیا جائے تو کئی جلدیں مرتب ہوجائیں گی۔ ہم اپنے بچپن بلکہ نسل درنسل سے سنتے آرہے ہیں کہ جہاد چونکہ چھوڑ دیا ہے مسلمانوں نے جہاد کا راستہ ترک کردیا ہے اس لیے ساری مصیبتیں ہم پر نازل ہورہی ہیں۔ لیکن جہاد کی تعریف ابھی تک نہیں ہوئی۔

1947ء میں پاکستان کے قیام کے بعد کشمیر پر جب پٹھان رضاکاروں نے جانا شروع کیا تو اس کو جہاد کا نام دیا گیا۔ اس وقت کے ہمارے جید عالم مولانا مودودی نے اس کو جہاد ماننے سے انکار کیا اور آج تک فیصلہ نہیں ہوسکا کہ وہ جہاد تھا یا نہیں۔ پھر اس کے بعد امریکہ کے پیسے اور امریکہ کے اسلحے کے ساتھ سوویت یونین کے خلاف جہاد ہوا۔ اس کو جہاد کا نام دیا گیا۔ پھر اسی امریکہ کے خلاف آجکل جہاد ہورہا ہے۔ پتہ نہیں چل رہا کہ اصل جہاد کون سا ہے؟

دوسری بات کہ وہ اسلامی ریاست! اس کے بارے میں بھی بچپن سے یہی پڑھتے آئے ہیں کہ خلافت راشدہ کا زمانہ اصلی اسلامی زمانہ تھا۔ اس کے بعد تو پھر ملوکیت آگئی۔ اس میں بھی پھر امویوں کا زمانہ، عباسیوں کا زمانہ، عثمانیوں کا زمانہ، کون سی صحیح اسلامی ریاست تھی؟ اس کا فیصلہ نہ کوئی کرسکا اور نہ کبھی ہوسکے گا۔

زیدی صاحب نے اپنے مقالے میں، موجودہ زمانے میں تین اسلامی ریاستوں کے جو تجربے ہوئے ہیں، ان کا ذکر کیا ہے۔ ان میں ایک تو طالبان کا جو دور ہے، اس کو انہوں نے اسلامی نظام کا نام دیا۔ اسے اسلامی ریاست صحیح معنوں میں کہنا چاہیے۔ تو میں سمجھتا ہوں اس کا تو ذکر ہی نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ وہ دور جو تھا، دو تین چار سال کا، جو بھی

تھا، اس کا کوئی تعلق اسلام سے نہیں تھا۔

دوسرا نام انہوں نے ایران کا لیا ہے۔ وہ بھی ابھی تجربے کے دور سے گزر رہا ہے۔ اصل جونمونہ عالم اسلام کے سامنے ہے، وہ ہے سعودی عرب۔ سعودی عرب کی جب ریاست قائم ہوئی، صحیح معنوں میں consolidate ہوکے، آج سے 70، 75 سال پہلے، تو اس میں جو ہوا، ایک مصنف، وہ بھی سعودی عرب سے تعلق رکھتے ہیں، سعید ابو ان کا نام ہے، ان کی کتاب ہے "The House of Saod"۔انہوں نے بتایا ہے کہ 1905ء اور 1930ء کے دوران جب یہ ریاست قائم ہورہی تھی اس وقت چالیس ہزار لوگوں کے سر قلم کردیئے گئے اور ساڑھے تین لاکھ آدمیوں کے اعضاء کاٹ دیئے گئے۔ آبادی اس وقت سعودی عرب کی بیس لاکھ تھی تو سات فیصد لوگوں کے اعضاء کاٹ دیئے گئے۔ ایک فیصد لوگوں کے سر قلم کردیئے گئے۔ اس کو اسلامی کہہ نہیں سکتے۔آپ کسی طرح انسانی نہیں کہہ سکتے۔ اس کو ہم رول ماڈل نہیں بنا سکتے۔ اسی طرح سے اور بہت سی چیزیں ہیں۔

ہمارے حسن لطیفی شہر لدھیانے کے شاعر گزرے ہیں۔ وہ شروع میں پاکستان کی تحریک کے خلاف تھے۔ وہ پوسٹر چھاپا کرتے تھے۔تو انہوں نے Falasy of Pakistan کا ترجمہ اغلوطہ پاکستان کیا۔تو مغالطے کی بجائے اغلوطہ مجھے زیادہ بہتر لگ رہا ہے۔ یہ اغلوطے اتنے ہیں ہمارے تاریخ میں کہ ہماری جوانی میں ایک صاحب نے، جو ٹیچر تھے، پڑھے لکھے آدمی تھے، انہوں نے کہا کہ مسلمانوں کو اسلام سے دور کرنا ہے تو کچھ نہ کرو، انہیں ان کی تاریخ پڑھا دو تو ہماری تاریخ بہت سی ایسی باتوں سے بھری پڑی ہے کہ ہم بہت نعرے لگاتے رہے ہیں، چودہ سو سال سے کہ یہ کریں، اسلامی نظام قائم کرلیں، جہاد کا راستہ اختیار کرلیں۔ موجودہ تاریخ میں اڑھائی سو تین سو سال پہلے شاہ ولی اللہ نے سب سے پہلے اس بات کو چھیڑا کہ اسلامی نظام قائم کریں گے تو سارے مسئلے حل ہوجائیں گے۔ جہاد کریں گے تو انہوں نے پہلی دفعہ یہ کہا کہ یہ معاملہ معاشی مساوات کا ہے دولت کی منصفانہ تقسیم کا ہے۔ انہوں نے اجتہاد پر بھی زور دیا لیکن اجتہاد کیا نہیں۔

وہ بھی مقلد ہوئے یعنی روایت کا اثر اتنا غالب رہا۔ مقلدین میں ان کا بھیشمار کیا جا سکتا ہے اور ان کے جو جاننے والے تھے، بعد میں احمد شہید بریلوی، انہوں نے تو باقاعدہ پھر سکھوں کے خلاف جہاد کیا جس کا فائدہ براہ راست انگریزوں کو پہنچا۔ جیسے سوویت یونین کے خلاف جہاد کا فیصلہ براہ راست امریکہ کو پہنچا اور عالم اسلام کو بچاتے بچاتے ہم نے عالم اسلام کو بالکل expose کر دیا۔ اب جو آخری ایک دیوار تھی مسلمانوں کی حمایت کرنے والی اس کو گرا دیا۔ اب کہتے یہ ہیں کہ ہم نے اسلام کی خدمت کی۔ اسی طرح جب سکھوں کے خلاف جہاد کیا اس کا فائدہ نہ صرف انگریزوں نے سرحد میں اٹھایا بلکہ بنگال میں جو انگریزوں کے خلاف تحریک چل رہی تھی کسانوں کی، اس کو بھی نقصان پہنچایا۔

اس طرح سے دو اڑھائی سو سال بعد علامہ اقبال نے بھی اجتہاد کی بات کی۔ وہ بھی مقلدین میں شامل رہے۔ ان میں بھی بے شمار ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں روایت چلی آ رہی ہے۔ تو ضرورت اس بات کی ہے مغالطوں کی ایک مکمل فہرست کسی نہ کسی طرح سے بنتی رہے۔ ہم نے تو جو suffer کرنا تھا، کر لیا، آنے والی نسلیں اس سے کسی حد تک محفوظ رہیں اور سیدھا سیدھا بنی نوع انسان کی روٹی روزگار، اس کی بہتری، اس کی بھلائی، جس سے اسلام منع نہیں کرتا۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں، جو ہمارے لیے سب سے بڑا منشور ہے، اس میں کہا رسول اللہ ﷺ سے اللہ نے، تم ان سے کہہ دو جو تم پر اعتراض کرتے ہیں کہ تمہارا دین تمہارے لیے اور میرا دین میرے لیے۔ اس سے بڑی سیکولرازم کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ صاف صاف لفظوں میں۔ لیکن ہم تو کہتے ہیں کہ ہم اپنا دین دوسروں پر مسلط کر کے رہیں گے۔ اسی طرح سے بار بار قرآن شریف میں ایک سے تین جگہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ جس آدمی نے بھی کسی معصوم کو قتل کیا اس نے پوری کائنات کو قتل کیا اور وہ ہمیشہ جہنم میں جلے گا اور ہم معصوموں کو قتل کرنے کے لیے ادارے بنا رہے ہیں اور اس کے لیے باقاعدہ لکھ رہے ہیں۔ Thesis پیش کر رہے ہیں۔ جہاد کا فلسفہ پیش کر رہے ہیں۔ تو بہت

suffer کیا اس قوم نے، ہماری نسل نے۔ ہماری یہ کوشش ہونی چاہیے کہ ہماری کم از کم آئندہ آنے والی نسل اس سے بچی رہے۔

☆☆☆☆☆☆

خالد احمد

درخشاں ماضی کا تصور یا مغالطہ ایسی چیز کو جنم دے گیا جس کو میں نظریہ استرداد کہوں گا کہ بعد میں آنے والی قرون وسطیٰ کی تاریخ کو رد کرنا اور ایک مثالی ریاست پر تکرار کرنا۔ اس وقت جتنے بھی مسلم معاشرے ہیں، غیر مستحکم ہیں۔ جہاں پر سیکولر ریاست قائم ہوتی ہے وہاں لوگ ناراض رہتے ہیں اور جہاں جمہوریت قائم ہوتی ہے وہاں پر بھی مسلمان ناراض رہتے ہیں۔ انہیں یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ ریاست نامکمل ہے۔ کب ریاست مکمل ہوگی؟ جب شریعت نافذ ہوگی۔ لیکن یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ شریعت کے نفاذ کے بعد ناراضگی اور بڑھ جاتی ہے۔ پھر ایک مثال بھی سامنے آئی کہ خود علما نے ریاست کی باگ ڈور سنبھالی۔ اس کے بعد جبر کرنا پڑا۔ یہ باہر کے لوگوں کے لیے ایک مثالی ریاست ضرور تھی۔

ہم نے امام خمینی کو نجات دہندہ کے روپ میں قبول کیا۔ بہت سے لوگ اخباروں میں لکھتے رہے کہ کاش ایسا ہی آدمی یہاں بھی آ جائے۔ شاید یہ ایک سوچ ہے جو اسلامی ریاست کے نظریے کے ساتھ منسلک ہے۔ جب افلاطون نے Rebublic لکھی تو اس میں بھی جبر کا عنصر تھا۔ Revolution French آئی تو آئیڈیالوجی کا لفظ متعارف ہوا۔ اسی طرح امام خمینی بھی ایک نجات دہندہ کے طور پر آئے اور ایک مثالی ریاست قائم کی تو کافی ہلاکتیں ہوئیں۔

پھر سنیوں کی جانب سے ایک اسلامی ریاست افغانستان میں قائم ہوئی اور یکدم ہمیں یہ احساس ہوا کہ ہم بھارت کے سامنے عسکری طور پر کمزور ہیں۔ نظریاتی طور پر ہم

افغانستان کے سامنے کمزور ہیں۔ جب جنگ کے بادل چھٹے تو بھارت تو ہمارا کوئی علاقہ نہ لے سکا لیکن نظریاتی جنگ میں ہمارے تقریباً دو صوبے گئے۔

یہ معاملہ مسلم معاشرے کا ہے جو ایک معکوس ترقی کی طرف جا رہا ہے۔ سوال یہ اٹھایا گیا کہ ہماری نئی نسل کو فیصلہ کرنا ہے کہ وہ جدیدیت کی طرف جاتے ہیں یا پرانے خیالات کی طرف۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہماری نسلوں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے۔ اکیسویں صدی کے آتے آتے ہم نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ہم جدیدیت کی طرف نہیں جائیں گے اور یہ جو استرداد ہے، قومی ریاست کا استرداد (یعنی کہ رد کرنا)، یہ اس مغالطے کا ایک بنیادی عنصر ہے کہ جس وقت ہم مثالی ریاست کا حوالہ دیں گے۔ اس وقت ہماری ریاست نامکمل یا پھر قابل استرداد ہوگی۔

امہ کا تصور قومی ریاست کے حوالے سے ایک تخریبی نظریہ ہے۔ جب بھی مسلمان امہ کے بارے میں سوچیں گے، انہیں قومی ریاستیں نظر آئیں گی۔ سعودی عرب سامنے آئے گا، کہیں گے اس میں ملوکیت ہے۔ اس کو الٹنا پڑے گا۔ ترکی سامنے آئے گا تو کیونکہ یہ لادین ہے، اس کو الٹنا پڑے گا۔ خود بھی الٹنا پڑے گا کیونکہ یہاں شریعت کے خلاف ایک نامکمل ریاست قائم ہے امہ کے تصور کی نفی OIC سے بھی ہوتی ہے۔ او آئی سی کے اندر قومی ریاستیں ہیں جو اس تصور کی نفی کرتی ہیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ او آئی سی ایک عسکری تنظیم ہے جو جوابی حملہ کرے گی لیکن وہ ایسا کرنے سے قاصر ہے۔ او آئی سی میں جو تبدیلیاں آ رہی ہیں وہ اس وجہ سے آ رہی ہیں۔ مسلمانوں کی تکرار او آئی سی کے بارے میں بڑھتی جا رہی ہے۔ مسلمان پیچھے کی جانب دیکھ رہا ہے اور او آئی سی کو گالی دے رہا ہے۔ لہٰذا پچھلے Summit میں سعودی عرب نے کہا کہ کیا اچھا نہ ہو بھارت کو بھی اس میں بٹھا لیں۔ ہمارے انکار کے باعث ایسا نہ ہو سکا لیکن روس کو observer کے طور پر بٹھایا گیا۔ او آئی سی کو اسی لیے بدلا جا رہا ہے کہ ہماری توجہ امہ کے تصور پر مرکوز ہے۔

اسی طرح ایٹم بم کے حوالے میں بھی امہ کا تصور موجود ہے کہ یہ بم تمام امہ کے

لیے ہے۔ اگر ایران کا ایٹم بم بنتا ہے تو سب سے زیادہ خائف عرب ممالک ہوں گے۔ یوں امہ کے تصور کی نفی ہوگی۔ تیسرا تصور جو کہ نہایت خوبصورت مقالہ تھا اور ایک طرح سے متبادل تصور ہے کیونکہ ہم طبری کو نہیں مانتے، ہم سیرت کو کم درجہ دیتے ہیں۔ تاریخ ابن خلدون نہیں پڑھتے کیونکہ عرب اس کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔ ہمارا مثالی ریاست کا تصور فقہی تقلیدی تصور سے جڑا ہوا ہے۔

ایک اور جس مغالطے کا اضافہ ہوسکتا تھا، وہ اجتہاد کا تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ اجتہاد ایسی چیز ہے جس کے ذریعے آپ تبدیلی لاسکتے ہیں۔ یہ مغالطہ ہے کیونکہ جب ہم فقہ سے جڑے ہوتے ہیں تو اس میں بھی ہم تبدیلی نہیں کرسکتے۔ ایک طریقہ اقبال نے چھٹے لیکچر میں بتایا تھا۔ انہوں نے قرآنی نص پر اجتہاد کیا۔ انہوں نے علامہ شبلی کا سہارا لے کر قطع ید کے خلاف بات کی تھی جو کہ قرآنی نص ہے۔ ہم قرآنی نص پر اجتہاد کر چکے لیکن وہ اجتہاد معکوس ہے۔ اس لیے کہ ہم نے طلاق کا قانون، جو کہ قرآنی نص ہے اس میں تبدیلی کی ہے۔

میرے خیال میں جہاد کا تصور سب سے زیادہ خطرناک اس وقت ہوتا ہے جب ریاست اس کی نجکاری کرتی ہے۔ اس وقت مولویوں میں بھی ایک بحث جاری ہے۔ اس وقت وہ بہت طاقتور ہیں۔ علامہ غامدی اور ان کے درمیان ایک جنگ چھڑی ہوئی ہے کہ آجکل کے علماء یہ نہیں سمجھتے کہ جہاد ریاست کی ذمہ داری ہے۔ اس میں خرابی یہ ہوئی کہ جہاد کی نجکاری کرکے ریاست کی داخلی خودمختاری ختم کردی گئی اور یوں ریاست کا چلنا ناممکن ہوا۔

آخر میں ایک بات کہ جب مثالی ریاست قائم ہوجاتی ہے تو سب سے پہلا کام یہ کرتی ہے کہ اپنے آپ کو ہمسایوں سے الگ تھلگ کرتی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنا نظریہ ایک انقلاب کے طور پر برآمد کرنا چاہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایران کی امام خمینی کے زمانے میں جو شکست ہوئی تو ایک انتہائی درجے تک الگ تھلگ ہوچکا تھا۔ اسی طرح ملاعمر کی مثالی ریاست جس کے باعث ہم خائف ہیں اور دوصوبے گنوا بیٹھے ہیں، ان کے دشمن ان کے ہمسایہ علاقہ میں پیدا ہوئے اور سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے نظریے

کو برآمد کرنا چاہتے تھے۔ ایسا عمل پہلے بھی ہو چکا ہے۔ مسلمان معروضی حوالے سے تاریخ پڑھیں تو ان کو سمجھ جانا چاہیے تھا کہ اس کی کیا وجہ ہے؟ کیونکہ ہم اس مثالی ریاست سے منسلک تھے۔ لہٰذا ایک Isolation کا عمل ہمارے اندر بھی تھا۔ اس کی سزا آج ہم بھگت رہے ہیں اور جبر کے تحت اچھے کام کر رہے ہیں۔

ہماری سوچ کا ایک اور مظہر امر اور نہی کا تصور ہے۔ ہمارے علما نے یہ نہیں جانا کہ جب ریاست قائم ہوتی ہے تو امر اور نہی کا تصور ختم ہوتا ہے۔ آج کا مسلمان جدید طریقے کی سوچ کو ترک کر چکا ہے۔ یہ کہنا کہ آج کی نسل فیصلہ کرلے کہ اس نے آگے چلنا ہے یا پیچھے، تو یہ ایک بے معنی بات ہے۔ ٹیلی ویژن کے نجی اداروں اور اخباروں کے ذریعے دیکھ لیں کہ اب یہ روش نہیں ہے کہ ہم نے انتخاب کرنا ہے۔ اب اگلا جو بحران آئے گا اس میں مسلمان شاید کسی اور طرف چلے جائیں گے۔ لیکن آج تک تقلیدی دور کے شروع ہونے کے بعد اسلامی سوچ میں تبدیلی نہیں آئی۔

میں زیدی صاحب کے مقالے کو بہت وقیع سمجھتا ہوں۔ لیکن ہمارے نزدیک اداروں کا نہ ہونا بالکل اہم نہیں ہے۔ یعنی اسلامی نظریاتی کونسل کا یہ کہنا کہ قرون اولیٰ کی مثالی ریاست میں نہ پولیس تھی نہ جیل خانہ جات، لہٰذا یہ آج بھی نہیں ہونے چاہئیں۔ یہ ہے ہمارا تصور، جو ہم سمجھتے ہیں کہ مکمل ہے۔ اس پر ہم اپنے آپ کو منطبق کرنا چاہتے ہیں۔ زیدی صاحب نے جو باتیں کی ہیں، معروضی طور پر بالکل درست ہیں لیکن معروضیت ایک نقطے کے بعد توہین بن جاتی ہے اور اس سے ہم سب بچتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆

مسعود اشعر

حسن جعفر صاحب نے اتنا وقیع مقالہ پیش کیا ہے اس پر مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہیں ہے۔ اس کے بعد حمید اختر اور خالد احمد صاحب نے جو باتیں کی ہیں وہ ہمیں سوچنے پر

مجبور کرتی ہیں کہ موجودہ زمانے میں ہم کن حالات سے گزر رہے ہیں۔ اس ضمن میں، میں چند باتیں کرنا چاہتا ہوں جن کا بسا اوقات ایک گالی کے طور پر ذکر کیا جاتا ہے۔ خاص طور پر برنارڈ لوئیس اور اسی قسم کے دوسرے جو لوگ ہیں، آجکل اور پہلے بھی ان کا انداز، بجا ہے کہ مسلمانوں کے خلاف ہے، لیکن اسلامی تاریخ کا اس نے جس طور سے مطالعہ کیا ہے وہ ایسا بھی غلط نہیں ہے۔

..... امریکہ نہیں جیتے گا۔ دنیا بدل چکی ہے اس طرح کے Imperealism کا زمانہ گزر چکا ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ اگر امریکہ کی شکست جلدی ہوجائے تو ہمیں اپنی اپنی جگہ مقدور بھر مزاحمت کرنی چاہیے۔ اپنے چھوٹے Imperialists کے ایجنٹوں کے بھی خلاف اور امریکہ کے خلاف دنیا ترقی ہی کرے گی۔ یہ کہنا کہ ہار گئے۔ انسان کبھی ہارا نہیں کرتا اور نہ ہی ہارا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

قیام پاکستان کی بنیاد: نظریاتی یا جدلیاتی

(یہ مضمون حلقہ ارباب ذوق لاہور میں 16 راگست 2009 کو اور ہالیڈے ان، رسل سکوئر، لندن میں پروگریسو فورم لندن کے اجلاس میں 25 راکتوبر 2009ء کو پیش کیا گیا)۔

آج پاکستان میں مذہبی دہشت گردوں اور طالبان نے قتل و غارت گری کا جو بازار گرم کر رکھا ہے اس کی جڑ میں جن نعروں اور نظریوں کا بیج بویا گیا اور جن کی آبیاری گزشتہ ساٹھ سال کے دوران کی گئی وہ کچھ یوں ہیں

نظریہ پاکستان، نظریاتی سرحدیں، نظریاتی ریاست، اسلامی ریاست، اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات، اسلامی نظام، نفاذ شریعت یا نفاذ اسلام، حکومت الہیہ کا قیام، اسلامی نظام کی تجربہ گاہ، احیائے اسلام، اسلامی اُمہ وغیرہ۔

ہم تاریخ پر نظر ڈالیں تو ان اصطلاحوں کا استعمال قیام پاکستان سے پہلے کہیں نظر نہیں آتا بلکہ اس کے کچھ عرصہ بعد شروع کیا گیا۔ دراصل یہ وہ دور تھا جب بین الاقوامی سامراج (اینگلو امریکی سامراج) اور مقامی حکمران طبقوں کو ان نعروں اور نظریوں کی شدید ضرورت پڑ گئی تھی۔ بین الاقوامی سامراج کو اس لئے کہ:

- سوویت روس اور ابھرتی ہوئی چین کی کمیونسٹ قوت کے گرد حصار قائم کرنے کے لئے سامراج فیصلہ کر چکا تھا کہ مذہب کو بطور نظریاتی ہتھیار کے استعمال کرے گا۔

مقامی حکمران طبقوں کو اس لئے کہ:۔

۔عوام اپنے معاشی، جمہوری حقوق کا مطالبہ کریں تو اسے نظریہ کے نام پر رد کیا جا سکے۔

۔بنگال کے عوام اپنے حقوق مانگیں، پٹ سن کی آمدنی کو بنگال پر خرچ کرنے کی بات کریں، ملازمتوں میں اپنا حصہ مانگیں، فوج میں بھرتی ہونے کی بات کریں، بنگالی کو قومی زبان بنانے کا نعرہ لگائیں اور آئین میں آبادی کی بنیاد پر ایک فرد ایک ووٹ کا مطالبہ کریں تو کہا جائے کہ نظریہ پاکستان کی مخالفت کی جا رہی ہے اور نظریہ کے نام پر گھڑے گئے ان نعروں کے نیچے کچل دیا جائے۔

۔سندھ، سرحد اور بلوچستان کے عوام اپنی صوبائی خود مختاری کا مطالبہ کریں تو ان نظریاتی ہتھیاروں کو استعمال کیا جائے۔

۔پاکستان کے عوام بالعموم اپنے معاشی خوشحالی اور بنیادی حقوق کے مطالبات اُٹھائیں تو بھی یہ نظریاتی ہتھیار استعمال میں لائے جائیں۔

ہم یہ دیکھتے ہیں کے ان نظریوں کا سہارا لے کر

۔اینگلو امریکی سامراج نے اسلامی بلاک بنانے کے لئے پاکستان کو آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا۔ اسلامستان بنانے کے مشن پر چوہدری خلیق الزمان کو مسلمان ملکوں کے دوروں پر بھیجا گیا۔ پھر Middle East Defence Organization (MEDO) کے قیام کے لئے چوہدری ظفراللہ وزیر خارجہ پاکستان کو مسلمان ملکوں میں بھیجا گیا اور بال آخر بغداد پیکٹ وجود میں آیا جسے بعد میں CENTO کا نام دے دیا گیا۔

۔ملک میں آئین سازی کے عمل کو طول دے کر پس پشت ڈال دیا گیا۔

۔قائداعظم کی 11/اگست 1947ء کی دستور ساز اسمبلی کی افتتاحی تقریر کو نظر انداز کر کے قرارداد مقاصد منظور کی گئی جو چند تجریدی Abstract مذہبی نعروں پر مبنی

تھی۔اسمبلی کے اقلیتی ارکان نے اس کی مخالفت میں تقریریں کیں اور اس کے خلاف ووٹ دیا۔ وزیر قانون جوگندر ناتھ منڈل ملک چھوڑ کر ہندوستان چلا گیا۔

۔1953ء میں مذہبی جماعتوں کے قادیانی ایجی ٹیشن کے نتیجے میں لاہور میں مارشل لاء لگا جو پاکستان کا پہلا مارشل لاء تھا۔

۔1954ء میں دستور ساز اسمبلی کے بنائے ہوئے آئین کو مسترد کرتے ہوئے اسمبلی کو توڑ دیا گیا

۔1955ء میں سندھ، سرحد، بلوچستان، پنجاب کا ون یونٹ بنا کر تخت لاہور کے تحت صوبہ مغربی پاکستان بنا دیا گیا

۔1956ء میں اسٹیبلشمنٹ کے نمائندے چوہدری محمد علی نے پہلا دستور بنایا جس میں پیریٹی کے نام پر مشرقی پاکستان کے 54 فیصد کو مغربی پاکستان کے 46 فیصد کے برابر کر دیا گیا۔ یہ چوہدری محمد علی وہی شخص ہے جس نے 60 کی دہائی میں نظام اسلام پارٹی بنائی اور 64 اور 70 کے انتخابات میں دائیں بازو کے اتحاد میں شامل ہو کر حصہ لیا اور یہی شخص ہے جس نے سیکرٹری جنرل حکومت پاکستان کی حیثیت سے پہلی پریس ایڈوائس جاری کی تھی کہ قائداعظم کی 11/اگست کی تقریر کے مکمل متن کو شائع نہ کیا جائے (مگر ڈان کے ایڈیٹر الطاف حسین نے پورا متن شائع کیا)۔

۔56-58 کے عرصہ میں لیاقت علی خان، چوہدری محمد علی، سر ظفر اللہ، غلام محمد، سکندر مرزا وغیرہ نے اسلام اور نظریہ کے نام پر ملک کو سیاسی طور پر غیر مستحکم کیا اور ایوب خان کے مارشل لاء کی راہ ہموار کی۔

۔ایوب خان کے دس سالہ دور میں اسلام اور نظریہ کا کئی بار استعمال کیا گیا۔غلاف کعبہ، کشمیر کا جہاد اور 65ء کی جنگ میں اپنے اقتدار کو طول دینے کے لئے لوگوں کے مذہبی جذبات سے کھیلا گیا۔

۔یحییٰ خان کے تین سالہ دور میں نظریہ سازی کی سرکاری فیکٹریوں نے بڑھ چڑھ کر کام کیا اور تمام سرکاری وسائل دائیں بازو کی نظریہ باز جماعتوں کے حوالے کر دیئے گئے۔70ء کے انتخاب کا نتیجہ آیا تو اس کے نتائج یہ کہہ کر مسترد کر دیئے گئے کہ نظریہ پاکستان کی مخالف جماعتیں کامیاب ہو گئی ہیں۔ اس لئے ان انتخابات کو کالعدم کر کے نئے انتخاب کرائے جائیں اور مشرقی پاکستان میں اس انتخاب کو کالعدم کر کے فوجی ایکشن کر دیا گیا اور اسلام اور نظریہ پاکستان کے نام پر جعلی انتخابات کرائے گئے۔ مذہبی انتہا پسند تنظیمیں الشّمس اور البدر نظریہ پاکستان کے نام پر فوجی ایکشن میں شامل ہو گئیں۔ 71ء میں نظریہ پاکستان کے نام پر پاکستان کو توڑ دیا گیا۔

۔72-77ء بھٹو دور میں مذہبی اور دائیں بازو کی جماعتوں نے اسلامی نظام اور نظریہ پاکستان کے نعروں کا بے دریغ استعمال کیا اور بھٹو حکومت کو مسلسل غیر مستحکم کرنے کی کوشش کی گئی۔

۔74ء میں قادیانی ایجی ٹیشن کر کے احمدیوں کو اقلیت قرار دلوایا گیا۔ 77ء کی PNA کی تحریک، نظام مصطفےٰ تحریک، فوجی کمانڈوز نے دینی مدرسوں کے طالب علموں کو مسلح ہو کر مظاہروں میں حصہ لینے کی ٹریننگ دی۔ بھٹو حکومت کا نظریہ پاکستان کے نام پر تختہ الٹ دیا گیا۔

۔77-88ء، ضیا دور۔ نظریہ سازی کی جو فصل گزشتہ 30 سال میں بوئی گئی تھی، اب اس کے کاٹنے کا وقت آ گیا تھا۔ ضیا الحق اور امریکی سامراج نے نفاذ اسلام، نفاذ شریعت، حدود آرڈیننس، چادر اور چار دیواری، پھانسیاں، کوڑے، جلاوطنیاں، کلاشنکوف کلچر، ہیروئین اور سب سے بڑھ کر جہاد افغانستان کے ذریعے پاکستان کے سیاسی، ثقافتی، معاشرتی اور اخلاقی نظام کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ درسی نصاب کی کتابوں، ملازمتوں کے لئے انٹرویوز اور ترقیوں کے لئے

معیار، نظریہ کے نام پر گھڑے گئے ان نعروں کی بھینٹ چڑھا دیئے۔

۔99-88 بے نظیر اور نواز شریف کے میوزیکل چیئرز اقتدار کے ادوار میں ISI نے ضیا دور کی تمام داخلی اور خارجی پالیسیوں کو من وعن جاری رکھا۔ افغانستان میں جہادی تنظیموں کی خانہ جنگی کے دوران ان کی سرپرستی جاری رہی۔ یہاں تک کہ طالبان تنظیم کو اقتدار میں لایا گیا۔ پاکستان کے اندر بھی سپاہ صحابہ، سپاہ محمد، لشکر جھنگوی، لشکر طیبہ اور جیش محمد پروان چڑھائی گئیں۔

۔99ء تا2009ء یعنی مشرف دور اور بعد۔9/11 کے بعد کا پاکستان۔ مذہبی انتہاپسندی جنونیت میں تبدیل ہوگئی۔ لال مسجد اور اسی قبیل کے مدرسوں میں خود کش حملہ آوروں کی فیکٹریاں قائم ہوگئیں جنہیں ISI اور اسٹبلشمنٹ نے پروان چڑھنے دیا۔ اعجاز الحق، چوہدری شجاعت حسین اور دیگر حکومتی عہدیدار، ان کی سرپرستی کرتے رہے اور میڈیا کے بہت سے lead anchors بھی ان کی حمایت میں پیش پیش رہے۔ ملک مذہبی جنونیوں اور دہشت گردوں کے ہتھے چڑھ گیا اور بے گناہ معصوم لوگوں، سکول کے بچوں اور عورتوں کا بہیمانہ قتل عام کیا گیا، سارا ملک اس مذہبی جنونیت کے آتش فشاں کے دہانے پر رکھ دیا گیا اور اب اس میں بھی کوئی شبہ نہیں رہ گیا کہ اس پورے ڈرامہ کے پس پشت امریکی، برطانوی اور بھارتی ایجنسیاں ہیں جو ان کو جدید اسلحہ، ٹریننگ اور ڈالرز فراہم کر رہے ہیں۔

ہم نے اس نام نہاد نظریہ پاکستان اور دوسرے نظریاتی نعروں کے سراب کے پیچھے بھاگتے ہوئے جو شدید نقصانات اُٹھائے ہیں، سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی سطح پر جو Reverse Gear لگا ہے اس سے ہم قریب قریب پتھر کے زمانے میں پہنچ گئے ہیں۔ اصل کنفیوژن نام نہاد پڑھے لکھے درمیانے طبقہ کی سوچ کا ہے جس میں اکثریت پروفیشنلز کی ہے جن کے ذہنوں میں ایک طالبان بٹھا دیا گیا ہے۔ گزشتہ ساٹھ سال میں اسٹیبلشمنٹ اور عالمی سامراج نے اس پر بہت کام کیا۔ تمام سرکاری وغیر سرکاری وسائل اور بین الاقوامی

وسائل بروئے کار لائے گئے۔ درسی کتابوں، اخبارات و رسائل، تقریروں، تحریروں، تعلیمی اداروں، ابلاغ کے اداروں اور فوجی افسروں کے تربیتی اداروں میں تاریخ کو مسخ کر کے جو نظریاتی تربیت کی گئی اس نے نام نہاد پڑھے لکھے درمیانے طبقہ کو ذہنی طالبان بنا دیا ہے۔

آیئے دیکھیں کہ نظریہ پاکستان اور دیگر نظریاتی نعروں کی اصلیت کیا ہے؟

قیام پاکستان کے بارے میں ایک نظریہ تو یہ پیش کیا جاتا ہے کہ:

''برصغیر کے مسلمانوں کو اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے ایک ملک چاہیے تھا۔ چنانچہ پاکستان دراصل اسلامی نظام کی تجربہ گاہ کے طور پر حاصل کیا گیا ہے۔ یہ ایک نظریاتی ملک ہے اور اس کی نظریاتی سرحدیں ہیں جنہیں جغرافیائی سرحدوں سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ علامہ اقبال نے اس کا خواب دیکھا تھا۔ قائداعظم نے اس کی تعبیر کی۔''

اس تصور کو نظریہ پاکستان کا نام دیا جاتا ہے۔ پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کا سرکاری نظریہ بھی یہی ہے۔ اس تصور کو ان مراعات یافتہ طبقات نے اختیار کیا جو محکوم طبقوں اور قومیتوں پر اپنی سیاسی و معاشی بالادستی کو قائم کرنے کے لیے اسلام کی آڑ استعمال کرنا چاہتے تھے۔ علاوہ ازیں اس تصور کی نقیب سیاسی جماعتیں جو ''نفاذ اسلام'' کے نعرے کو متذکرہ طبقات کی بالادستی اور جہادی کلچر کو مسلط کرنے کے لیے استعمال کرتی ہیں، تحریک پاکستان کے دوران قیام پاکستان کی شدید مخالفت کرتی رہی ہیں۔

ایک دوسرا تصور بھی پایا جاتا ہے:

''برصغیر کے مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین کوئی تضاد نہیں تھا۔ انگریزوں نے لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی اختیار کر کے ان کے مابین صدیوں سے قائم بھائی چارہ کو ختم کیا اور پھر سازش کے ذریعے ملک کو تقسیم کر کے چلے گئے تاکہ برطانوی سامراج کے مفادات پورے ہوتے رہیں۔''

یہ انڈیا کی اسٹیبلشمنٹ کا سرکاری مؤقف ہے اور اسے پاکستان کے بعض، تمام نہیں، ترقی پسند، بائیں بازو اور لبرل کہلوانے والے لوگ بھی اختیار کیے ہوئے

ہیں۔ وہ پاکستان کو توڑنے اور تاریخ کی اس غلطی کو درست کر کے بھارت اور پاکستان کے درمیان لکیر کو مٹانے کی بات بھی کرتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کی وفاداریاں اور مفادات سرحد پار ہیں اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اسلام آباد کے مسلسل جبر اور ناانصافیوں سے تنگ آ کر چھوٹے صوبوں کے بعض قوم پرست رہنما بھی اس تصور کو اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

یہ دونوں تصوراتی یا نظریاتی ماڈل یا موقف جو مختلف مخصوص مفادات کے تحت وجود میں آئے یا لائے گئے ہیں، جب تاریخی جدلیات کے دھارے کے سپرد کیے جائیں تو خس و خاشاک کی طرح بہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مطالعہ تاریخ دراصل ایک سائنس ہے۔ اس میں ذاتی پسند یا ناپسند کا کوئی دخل نہیں ہے۔ تاریخ کوئی عقیدہ نہیں ہے۔ اس کا مطالعہ عقائد کی بنیاد پر نہیں بلکہ معروضیت کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ عقائد خواہ دائیں بازو کے ہوں یا بائیں بازو کے، عقیدہ پرستی کے شکنجے میں پھنس کر نہ تو ماضی کی اصل حقیقت سے آگاہی حاصل ہو سکتی ہے، نہ حال کو سمجھا جا سکتا ہے اور نہ مستقبل کے بارے میں کوئی درست پیش گوئی کی جا سکتی ہے۔

تاریخ عالم ملکوں اور سلطنتوں کے عروج و زوال سے عبارت ہے۔ مختلف قبیلوں، گروہوں، قوموں، نسلوں، طبقوں اور فرقوں کے باہمی ٹکراؤ یا جدل کے نتیجے میں نئے ملک اور سلطنتیں وجود میں آئیں اور پھر ٹکراؤ اور جدل کے اسی عمل نے ان کا شیرازہ بکھیر دیا اور نئے ملک یا سلطنتیں وجود میں آ گئیں۔ ملکوں یا سلطنتوں کی سرحدوں کو کبھی دوام حاصل نہیں ہوا۔ کسی ملک یا سلطنت کی عمر کا انحصار اس کی داخلی و خارجی قوتوں کے مابین تضادات کی حل پذیری پر رہا ہے۔ اگر تضادات حل ہوتے رہیں تو عمر لمبی ہو جاتی ہے ورنہ مختصر۔ اس وقت دنیا کا جو نقشہ ہے اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہے۔ گذشتہ بیسویں صدی میں یہ تین مرتبہ بڑی تبدیلیوں سے گزرا۔ ایک پہلی عالمی جنگ کے بعد، دوسرا دوسری عالمی جنگ کے بعد اور تیسرا سرد جنگ کے خاتمے پر۔ اس دوران کبھی غالب مغلوب

ہوجاتے رہے اور کبھی مغلوب غالب!

برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں غالب و مغلوب کی جدلیات ہندوؤں اور مسلمانوں کے حوالے سے کم و بیش بارہ تیرہ سو سال پہلے شروع ہوئی۔ جب برصغیر کے مغرب میں سندھ اور پھر پنجاب پر مسلمان حملہ آوروں نے حکمرانی اور غلبہ حاصل کیا۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین معاشرتی اور ثقافتی تفریق بھی بہت زیادہ تھی۔ غزنوی دور کے مسلمان مفکر ابوریحان البیرونی نے اپنی تصنیف کتاب الہند میں اس تفریق کی شدت کی نشاندہی کرتے ہوئے یہ انکشاف کیا تھا کہ'' ہندو تمام غیرملکیوں یعنی مسلمانوں کو ملیچھ یعنی ناپاک سمجھتے ہیں اور اگر کوئی مسلمان یا غیرملکی چاہے بھی تو وہ ان میں داخل نہیں ہوسکتا۔ گویا دونوں فرقوں میں سے کوئی ایک فرقہ بھی دوسرے میں جذب نہیں ہوسکے گا۔''[1] برصغیر کے وسیع علاقے پر مسلمان سیاسی، معاشی ، ثقافتی اور معاشرتی طور پر غالب اور ہندو مغلوب رہے۔ مسلمان حکمران تھے اور ہندو رعیت یا باجگزار۔ مسلمان حکمران قرون وسطیٰ کے مروجہ استبدادی دستور کے مطابق رعیت اور محکوم پر وہ تمام ظلم و زیادتی روا رکھتے تھے جو اس استبدادی نظام میں رائج تھا۔ اس استبداد کا اگرچہ مذہب سے تعلق نہیں تھا، مروجہ دستور ہی یہ تھا' تاہم غالب کا مذہب غالب اور مغلوب کا مذہب مغلوب تھا۔ اس وقت کے مسلمان مورخین منہاج الدین سراج، ضیاء الدین برنی، محمد قاسم فرشتہ، نظام الدین احمد بخشی اور ملاعبدالقادر بدایونی وغیرہ کی ضخیم تصانیف تاخت وتاراج کی ان تفاصیل سے بھری پڑی ہیں جو مسلمان حکمران اور حملہ آور مفتوحہ اور مقبوضہ علاقوں پر کرتے تھے۔ مندر تباہ و مسمار کیے جاتے تھے، بت توڑے جاتے تھے۔ تاہم خراج ادا کرنے کی صورت میں مندر اور بت محفوظ رہتے تھے اور یہ بھی درست ہے کہ اس طویل دور میں ہمیشہ ایسا نہیں ہوا۔ ہندو مسلم تضاد کو ختم کرنے یا کم کرنے کی کوششیں بھی ہوئیں جو بعض ادوار میں کامیاب بھی ہوئیں۔ اس ضمن میں مغل شہنشاہ اکبر کا دور اور کشمیر کے حکمران زین العابدین اور بعض اور علاقائی حکمران قابل ذکر ہیں۔ مسلمان صوفیاء کا کردار بھی اس تضاد کو کم کرنے اور فرقہ وارانہ ہم

آہنگی برقرار رکھنے میں بڑا اہم رہا۔ خصوصاً چشتیہ سلسلہ کے بزرگان نظام الدین اولیا، امیر خسرو اور بابا فرید الدین وغیرہ۔ تاہم طریقت اور شریعت کا تضاد بھی ساتھ ساتھ کارفرما تھا۔ اہل شریعت اس دور کے ''نظریاتی'' ماڈل کے علمبردار تھے۔ جب حکمران ان کا زیادہ اثر قبول کرلیتا تو ہندو مسلم تضاد میں شدت آجاتی اور جب حکمران صوفیاء کے مسلک کے زیادہ زیر اثر ہوتا تو یہ تضاد نرم پڑ جاتا تھا۔ صوفیا کی اس تحریک میں بھگتی تحریک نے اہم کردار ادا کیا۔ اس طرح یہ تاریخی جدل غالب و مغلوب کی کشمکش سے ہوتا ہوا اٹھارویں صدی کے آغاز میں پہنچا تو مغل زوال پذیر ہوچکے تھے اور مرہٹہ ایک بڑی قوت بن چکے تھے۔ 1757ء میں احمد شاہ ابدالی نے انہیں پانی پت کے میدان میں شکست فاش دی لیکن اس کا فائدہ مسلمانوں کو نہ ہوا۔ تھوڑے عرصے بعد احمد شاہ ابدالی کے ایک سکھ سپاہی رنجیت سنگھ نے پنجاب، کشمیر اور پشاور پر اپنی حکومت قائم کرلی اور ادھر بنگال و بہار میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت قائم ہوگئی۔ اس حکومت کے قیام میں ہندو مارواڑی سیٹھوں نے بھی بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔

اٹھارویں صدی کے انجام اور انیسویں صدی کے آغاز میں برصغیر کے طاقت کے توازن میں ایک کیفیتی تبدیلی (qualitative change) آچکی تھی۔ وہ جو ہزار سال سے مغلوب تھے یعنی ہندو، نئی غالب قوت یعنی انگریزی استعمار کے وفادار بن گئے یا کمپراڈور بن گئے۔ راجہ رام موہن رائے کی ترغیب پر انہوں نے انگریزی تعلیم حاصل کی اور نئے انتظامی و سیاسی ڈھانچہ میں ایک جونیئر پارٹنر کی حیثیت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ مسلمان اشرافیہ جو لارڈ ہیسٹنگز (Hastings) کے عارضی بندوبست اور لارڈ کارنوالس (Cornwalis) کے بندوبست دوامی کا شکار ہوکر اپنی دولت و جاگیر سے محروم ہوگئے۔ ان کی جاگیردارانہ اخلاقیات اور کرم خوردہ سماجی اقدار ان کو انگریزی تعلیم کی جانب مائل نہ کرسکی۔ مسلمان درمیانہ اور غریب طبقہ کو بھی جاگیرداروں کی قیادت اور علماء کی قیادت، جن

میں وہابی اور فرائضی تحریک کے جہادی بھی شامل تھے، ایک طویل عرصہ تک جدید تعلیم اور نئے نظام سے دور رکھے رہے۔ علاوہ ازیں صدیوں سے مغلوب ہندو ،جو نئے تناظر (Paradigm Shift) کے بعد نئی غالب قوت انگریز کے جونیئر پارٹنر تھے، اپنی پوری کوشش کرتے تھے کہ مسلمان کی ترقی کا راستہ روکیں۔

1857ء کی جنگ آزادی یا غدر کے بعد جو پاور سٹرکچر ابھر کر سامنے آیا اس میں سب سے اوپر غالب قوت انگریز تھے، دوسرے نمبر پر نئی ابھرتی ہوئی ہندو بورژوازی تھی اور تیسرے اور نچلے درجے پر مسلمان تھے جن میں چند مسلمان ریاستوں کے نوابین کو مستثنیٰ کر سکتے ہیں۔ اب جدلیات ان تین قوتوں کے درمیان تھی۔ انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی کی انتظامیہ کو ہٹا کر براہ راست تاج برطانیہ کی عملداری قائم کر چکے تھے اور اسے مستحکم کر رہے تھے۔ نئی ہندو بورژوازی کو پہلی بار یہ اندازہ ہوا تھا کہ یورپ کے صنعتی انقلاب نے جو جمہوری نظام جنم دیا ہے اس نے عددی اکثریت کی بنیاد پر ان کے لیے حصول اقتدار کا راستہ کھول دیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے غلبہ کے حصول کے لیے یورپ کے بورژوا نیشنلزم کے تصور کا من وعن ہندوستان پر اطلاق کرنے کی کوشش کی لیکن اس میں در پردہ بورژوا لبرل سوچ کے بجائے ہندو احیاء اور ہندو غلبہ کی کوشش تھی جس میں مسلمانوں کے لیے کوئی جگہ نہیں رکھی گئی تھی۔ وہ اپنی جدلیات میں ایک طرف انگریز کے ساتھ اقتدار و اختیار میں زیادہ سے زیادہ حصہ لینے کی جدوجہد کر رہے تھے اور دوسری طرف مسلمانوں کو مکمل طور پر مغلوب ومحکوم بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔

اٹھارویں صدی کے وسط سے انیسویں صدی کے وسط تک کے 100 سال میں برصغیر کے سیاسی، معاشی و معاشرتی منظر میں جس قدر بڑی تبدیلی یا Paradigm Shift آیا تھا، اس کے نتیجے میں مسلمانوں کو جس جدلیات کا سامنا تھا اس کے لیے اس 100 سال میں انہیں شاہ ولی اللہ، سید احمد شہید، شاہ اسماعیل شہید، جمال الدین افغانی اور علمائے دیوبند کے نظریاتی مذہبی ماڈل نے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ ان مذہبی رہنماؤں کو اس بات سے کوئی غرض

نہ تھی کہ سیاست، معیشت اور معاشرت کی جدل میں مسلمان ہندوؤں کے مدمقابل کیسے کھڑے ہوں گے۔

جس زمانے میں رام موہن رائے ہندوؤں کو انگریزی تعلیم اور جدید سائنس پڑھا رہا تھا، اسی زمانے میں سید احمد، شاہ اسماعیل اور ان کے بعد کے وہابی تحریک کے قائدین مسلمانوں کے جہادی جتھے بھرتی کر کے پشاور میں طالبان ٹائپ اسلامی حکومت قائم کرنے میں مصروف تھے۔ بالآخر مسلمان اپنے تاریخی جدل کے جدید تقاضوں سے نمٹنے کے لیے سرسید احمد خاں، نواب لطیف اور سید امیر علی جیسے لوگوں کے ساتھ شامل ہوئے۔ انہوں نے راجہ رام موہن رائے والا کام کم وبیش 50 یا 60 سال کے بعد شروع کیا اور یہ ایک ایسا فرق تھا جسے مسلمان کبھی پورا نہیں کر سکے۔

انیسویں صدی کے اواخر تک ہندوؤں نے انگریزوں کو آنکھیں دکھانا شروع کر دی تھیں۔ وہ انڈین نیشنلزم اور جمہوری حقوق کے نام پر اقتدار اور انتظامی ڈھانچے میں اپنے لیے زیادہ سے زیادہ حصہ لینے کے مطالبات کر رہے تھے۔ 1885ء میں انڈین نیشنل کانگریس خود ایک انگریز لارڈ ہیوم نے قائم کر دی تھی۔ تاکہ زیادہ مراعات کے حصول کی تحریک ایک بورژوا جمہوری پلیٹ فارم سے ہو اور کہیں یہ تشدد کا راستہ نہ اختیار کر لے۔ یاد رہے کہ انڈین نیشنلزم کا کوئی وجود ہندوستان کی تاریخ میں نہیں رہا۔ برصغیر کبھی ایک سلطنت یا ملک کے طور پر موجود نہیں رہا۔ خصوصاً جنوبی اور مشرقی ہند ہمیشہ ایک الگ دنیا تھا اور شمالی و مغربی ہند ایک دوسری دنیا۔ یہاں تک کہ ہندومت بھی مختلف علاقوں میں مختلف تھا۔ مختلف علاقوں کے دیوی دیوتا بھی اور رسوم و رواج بھی ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ مگر اس وقت ہندو اپنے مادی مفادات کے حصول اور اپنے غلبہ کے احیاء کے لیے انڈین نیشنلزم کے نعرے کو فروغ دے رہے تھے۔ بنگال کا سریندر ناتھ بینرجی اور پونا کا بال گنگا دھر تلک اس سودیشی تحریک میں پیش پیش تھے۔

انیسویں صدی کے اواخر میں مسلمان بھی اپنی بقاء کی جدلیات کے تقاضے پورے

کرنے میدان میں اتر آئے تھے۔ سرسید احمد خاں کا موقف یہ تھا کہ ہندوستان ایک کثیر الاقوام برصغیر ہے۔ یہ ایک ملک نہیں ہے اور نہ یہاں رہنے والے ایک مذہب یا قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ سرسید نے برصغیر کا یورپ سے موازنہ کیا کہ جیسے یورپ میں کئی اقوام ہیں ویسے ہی برصغیر ہندوستان میں کئی اقوام ہیں اور یہاں انڈیشن نیشنل کانگرس کسی ایک قوم کی نہیں بلکہ ہندو اکثریت کے مفاد کی نمائندگی کررہی ہے۔ 1905ء کی تقسیم بنگال پر کانگرس کی جانب سے شدید ایجی ٹیشن نے یہ ثابت کردیا کہ مسلمانوں کے فائدے میں ہونے والی کسی انتظامی تبدیلی یا اقدام پر کانگرس کا رویہ کیا ہوگا۔ جس کے بعد 1906ء میں سرآغا خاں اور دوسرے مسلم زعماء نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں مسلم لیگ کے قیام کا فیصلہ کیا اور سرسید کی تعلیمی تحریک ایک سیاسی تحریک میں تبدیل ہوگئی۔

بیسویں صدی کا آغاز ہوا تو برصغیر میں تینوں قوتوں کے مابین جدلیات کی کشمکش کچھ یوں تھی۔ پاور اسٹرکچر میں دوسری پوزیشن کے حامل ہندو جلد از جلد انگریز کو حاصل پہلی پوزیشن پر پہنچنا چاہتے تھے اور غلبے کے حصول کی اس کوشش میں مسلمانوں کی حیثیت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ وہ انڈین نیشنلزم اور سیکولرازم کی تعریف یوں کرتے تھے کہ کوئی ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی نہیں ہے، سب ہندوستانی ہیں۔ وہ ان کی قومی شناخت کا انکار کرکے ان کو اپنی عددی اکثریت کے نیچے کچل ڈالنا چاہتے تھے۔ یوں وہ مسلمانوں سے گزشتہ ایک ہزار سال کا بدلا بھی لینا چاہتے تھے۔ ادھر مسلمان اس صورتحال میں اپنی بقا کی جدوجہد کررہے تھے۔

مسلمان انڈین نیشنلزم کی تعریف یوں کرتے تھے کہ ہندوستان میں آباد دونوں بڑی قوموں کے وجود کو تسلیم کیا جائے اور وہ آپس میں معاملات طے کرکے انڈین نیشنلزم کے لیے کام کریں۔ ان کے سیاسی، معاشی و معاشرتی حقوق تسلیم کیے جائیں اور ہر سطح پر انہیں ان کا حصہ دیا جائے۔ برصغیر کے مغرب اور مشرق کے وسیع علاقوں میں وہ اکثریت میں تھے۔ وہ متحدہ ہندوستان کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنی حیثیت کو منوانا چاہتے تھے۔

ادھر انگریز اپنی بین الاقوامی سامراجی سیاست میں اتار چڑھاؤ کا شکار تھے۔ پہلی

جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم اور دونوں جنگوں کے درمیانی عرصہ میں ان کی کوشش رہی تھی کہ ہندوستان میں داخلی امن رہے اور وہ جنگی تیاریوں میں ہندوستان کے وسائل کا بھرپور استعمال کرسکیں۔ اس کے لیے وہ ہر دس سال بعد آئینی اصلاحات کا ایک پیکیج لاتے تھے۔ لیکن ہر پیکیج سے پہلے اور بعد ہندو۔ مسلم تضاد شدید ہوجاتا تھا۔ وجہ یہ ہوتی تھی کہ کانگرس اس پیکیج میں بلاشرکت غیرے زیادہ سے زیادہ حصہ لینے کی کوشش کرتی۔ خود کو پورے ہندوستان کے عوام کا واحد نمائندہ ثابت کرتی جبکہ حقیقت میں مسلمانوں کے فائدے کا کوئی کام ہوتا تو اس کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہوجاتی۔ مسلمانوں کا اعتماد کانگریس سے اٹھتا چلا گیا اور ہندو۔ مسلم جدلیات کے نتیجے میں آل انڈیا مسلم لیگ اور آل انڈیا مسلم کانفرنس ان کی نمائندہ جماعتوں کے طور پر ابھر آئیں۔ چونکہ کانگرس آبادی کے لحاظ سے بڑے حصے کی نمائندہ تھی اور اس کی ایجی ٹیشن کی قوت بھی زیادہ تھی اس لیے وہ انگریزوں سے اپنی بات منوانے میں کامیاب ہوجاتی تھی۔

1905ء میں تقسیم بنگال سے لے کر 1947ء کی تقسیم ہندوستان تک جدلیات کی یہ مثلث اسی کشمکش کا شکار رہی۔ کانگرس کی سودیشی تحریک کے دباؤ سے 1911ء میں تقسیم بنگال کی تنسیخ کردی گئی اور مسلمانوں کو اس کے عارضی سیاسی و معاشی ثمرات سے محروم کردیا گیا۔ 1909ء کی منٹو۔مورلے اصلاحات اور 1919ء کی مانٹیگو۔چیمسفورڈ اصلاحات کے نتیجے میں بننے والی لیجسلیٹو کونسلوں میں جداگانہ نمائندگی کا اصول تسلیم کرتے ہوئے مسلمانوں کو نمائندگی دے دی گئی تھی لیکن وہ مسلم اکثریتی صوبوں میں بھی اپنی آبادی کے تناسب سے بہت ہی کم تھی۔ تاہم مسلمان نمائندوں کی اکثریت کا تعلق مسلم لیگ سے تھا۔ محمد علی جناح بمبئی کونسل کے رکن تھے اور مسلم لیگ اور کانگرس دونوں میں شامل تھے۔ وہ 1916ء میں کانگرس اور مسلم لیگ کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے اور میثاق لکھنؤ طے کرانے کی وجہ سے ہندو۔مسلم اتحاد کے سفیر کہلاتے تھے۔ 20ء کے عشرے میں لیگ اور کانگرس نے سیلف رول یعنی سوراج کے لیے مشترکہ کوشش شروع کی اور لگا کہ جدلیات کی مثلث کے دو نقطے ایک

دوسرے کے قریب ہوکر زیادہ قوت سے سوراج حاصل کرلیں گے۔

پہلی عالمی جنگ کا خاتمہ، ترکی کی شکست اور خلافت کا خاتمہ، 20ء کے عشرے میں برصغیر کے مسلمانوں کی تمام تر توانائیاں تحریک خلافت میں بہا لے گیا۔ اس تحریک کا مقصد تو پورا نہ ہوا کیونکہ اتاترک نے خلافت کی بساط ہمیشہ کے لیے لپیٹ دی تھی۔ مگر برصغیر میں سیاسی مولویوں کی ایک بہت بڑی کھیپ تیار ہوگئی۔ ان کا کردار ہندو۔مسلم۔انگریز جدلیات میں زیادہ تر مثبت کردار کے بجائے منفی کردار ادا کرنے کا تھا۔ وہ مسلمانوں کو قرون وسطیٰ کے احیائے اسلام کی طرف دھکیلنے کی کوشش کرتے اور برصغیر سے انگریزوں کو نکالنے کے لیے کانگرس کا ساتھ دینے کی بھرپور حمایت کرتے تھے۔ مسلمانوں کے سیاسی، معاشی و معاشرتی حقوق کے تحفظ کی مسلم لیگ کی جدوجہد کی کھل کر مخالفت کرتے تھے۔

20ء کے عشرے کے اواخر میں دوسری عالمی جنگ کی تیاری شروع ہوچکی تھی۔ حکومت برطانیہ نے اگلا آئینی پیکیج لانے کے لیے ہندوستانی لیڈروں سے مشورے کے لیے سائمن کمیشن بھیجا جو 1927ء اور 1928ء میں دو مرتبہ ہندوستان آیا۔ ایک مرتبہ پھر ہندو۔مسلم۔انگریز کی جدلیات کی مثلث میں کشمکش تیز ہوگئی۔ مسلمان متحدہ ہند کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے سیاسی، معاشی، معاشرتی حقوق کا تحفظ چاہتے تھے۔ مسلم اکثریت کے علاقوں میں مکمل صوبہ کا درجہ صرف پنجاب اور بنگال کو حاصل تھا۔ سندھ صوبہ بمبئی کا حصہ تھا۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ مکمل صوبہ نہ تھا بلکہ ایک لیفٹیننٹ گورنر کے ماتحت مرکز سے کنٹرول کیا جاتا تھا۔ بلوچستان میں جو علاقہ برٹش بلوچستان کہلاتا تھا وہ ایک چیف کمشنری کا درجہ رکھتا تھا۔ باقی قلات اور دوسری ریاستوں پر مشتمل تھا۔ چنانچہ اس وقت مسلمانوں کی جدوجہد دراصل صوبائی خودمختاری کی تحریک کی شکل اختیار کرگئی تھی۔ ان کے اولین مطالبات میں سندھ کو بمبئی سے الگ کرنا، صوبہ سرحد اور بلوچستان کو مکمل صوبہ کا درجہ دینا شامل تھا۔ مزید برآں وہ ایک فیڈریشن کا ڈھانچہ چاہتے تھے جس میں صوبوں کے پاس زیادہ اختیارات ہوں اور مرکز کے پاس چند ضروری مرکزی محکمے ہوں۔ جبکہ کانگرس مضبوط مرکز کی

حامی تھی اور صوبوں کو کم سے کم اختیارات دینا چاہتی تھی۔ اس طرح ہندو۔مسلم جدلیات کی کشمکش اپنے اپنے مفادات کے حوالے سے مضبوط مرکز اور ڈھیلے ڈھالے وفاق کے مطالبوں کی شکل اختیار کر گئی تھی۔

ان حالات میں 1927ء۔ 1928ء کے دو سال میں سیاسی کشمکش میں تیزی آئی۔ جناح کی تجاویز دہلی سامنے آئیں پھر کانگرس اور لیگ سمیت آل پارٹیز کانفرنس منعقد ہوئی اور موتی لال نہرو کو سب کے مشترکہ مطالبات پر مبنی رپورٹ بنانے کا کام سونپا گیا تا کہ سائمن کمیشن کے ذریعے حکومت برطانیہ کو آئینی فارمولے کا ایک مشترکہ چارٹر پیش کر دیا جائے مگر نہرو رپورٹ نے مسلمانوں کے فائدے کے تمام مطالبات کو یکسر نظر انداز کر کے ایک مضبوط مرکز پر مبنی وحدانی طرز حکومت کا منصوبہ پیش کر دیا۔ مسلمان سخت مایوس ہوئے اور انہوں نے آل پارٹیز مسلم کانفرنس منعقد کر کے اپنا مطالبات کا علیحدہ چارٹر پیش کر دیا جسے قائداعظم کے چودہ نکات کہا جاتا ہے۔

محمد علی جناح حالات سے مایوس ہو کر انگلستان چلے گئے۔

یہاں تک یہ واضح ہو جاتا ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں کا سیاسی مسئلہ کیا تھا اور وہ کس قسم کی کشمکش سے دوچار تھے۔ مسئلہ نظریاتی ریاست کے حصول کا نہیں تھا بلکہ سیاسی و معاشی تحفظات کی کشمکش کا تھا۔ پاور سٹرکچر کے تینوں فریق یعنی انگریز، ہندو اور مسلمان ایک جدل میں ایک دوسرے کے ساتھ نبرد آزما تھے۔ لیکن ہمارے نظریاتی ریاست کے علمبردار اسے صرف ایک نظریاتی ریاست کے حصول کا مسئلہ سمجھتے ہیں اور اس مقصد کے لیے 1930ء کے مسلم لیگ کے الٰہ آباد کے سالانہ اجلاس میں علامہ محمد اقبال کے خطبہ صدارت کو بنیاد بناتے ہیں۔ آیئے اس خطبے کا مطالعہ کرتے ہیں۔

اس خطبے کا پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ اس کا مکمل متن نہ تو پڑھا جاتا ہے اور نہ درسی کتابوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ اس میں سے صرف ایک جملہ اپنے سیاق و سباق سے الگ کر کے پیش کیا جاتا ہے۔

جو یوں ہے کہ:

''میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ریاست میں ضم کر دیا جائے۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ سیلف گورنمنٹ، خواہ یہ سلطنت برطانیہ کے اندر ہو یا سلطنت برطانیہ کے باہر ہو، ایک مربوط شمال مغربی ہندی مسلم ریاست کی تشکیل مسلمانوں کی کم از کم شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کی تقدیر ٹھہرے گی۔''

اردو درسی کتابوں میں لفظ ریاست کے ساتھ ''خودمختار'' اور انگریزی درسی کتابوں میں "autonomaus" کے لفظ کا اضافہ بھی کیا جاتا ہے جو کہ اصل خطبہ میں نہیں ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ علامہ کا مذکورہ خطبہ 27-1928ء کے پس منظر میں ہے جس میں آل پارٹیز کانفرنس، نہرو رپورٹ اور آل پارٹیز مسلم کانفرنس اور قائداعظم کے چودہ نکات پیش ہوئے تھے۔ یہ پورا خطبہ ایک متحدہ ہندوستان کے دائرہ میں رہتے ہوئے ایک فیڈریشن پر مبنی ہے جو مسلمانوں کا عمومی مطالبہ تھا۔ اس فیڈریشن کے اندر آپ نے سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے پنجاب، سرحد اور بلوچستان کے ساتھ ضم کر کے ریاست بطور ایک فیڈرل یونٹ یعنی صوبہ کے طور پر مطالبہ کیا ہے اور یہ بھی آپ کا نیا مطالبہ نہیں ہے بلکہ آپ خود اس خطبے میں فرماتے ہیں کہ ''یہ تجویز نہرو کمیٹی کے سامنے بھی پیش کی گئی تھی۔ اس نے اس بنا پر اس تجویز کو رد کر دیا تھا کہ اگر اس قسم کی ریاست قائم ہوئی تو یہ بے ہنگم طور پر وسیع و عریض ریاست ہوگی جس کا انتظام کرنا دشوار ہوگا۔'' اس کا حل آپ نے یہ تجویز کیا کہ اگر انبالہ ڈویژن جو ہندو اکثریت کا تھا، نکال دیا جائے تو یہ مجوزہ ون یونٹ کا صوبہ قابل عمل ہو جائے گا۔

علامہ نے اپنے خطبے کے شروع کا حصہ مسلم قومیت کے تصور پر صرف کیا اور زور دیا کہ انڈین نیشنلزم برصغیر میں آباد قوموں کے وجود سے انکار میں نہیں بلکہ ان کے وجود کو تسلیم کرنے میں مضمر ہے۔ انڈین نیشنلزم کی یہ تعریف سرسید سے لے کر جناح تک تمام مسلم رہنما کرتے تھے اور اس بنیاد پر متحدہ ہندوستان میں ڈھیلے ڈھالے وفاق کے قیام کے خواہاں تھے۔ رینان کے ''قوم'' کے تصور کا حوالہ دیتے ہوئے آپ نے کہا ''اگر اکبر کا دین

الٰہی یا کبیر کی تعلیمات عوام الناس میں مقبول ہو جاتیں تو ممکن تھا کہ ہندوستان میں بھی اس قسم کی ایک نئی قوم پیدا ہوجاتی لیکن تجربہ بتلاتا ہے کہ ہندوستان کے مختلف مذاہب اور متعدد جاتیوں میں اس قسم کا کوئی رجحان نہیں کہ وہ اپنی حیثیت کو ترک کر کے ایک وسیع جماعت کی صورت اختیار کرلیں۔ قومیت ہند کا اتحاد ان تمام جماعتوں کی نفی میں نہیں بلکہ ان کے تعاون اور اشتراک اور ہم آہنگی پر مبنی ہے۔ میری رائے میں ہندوستان اور ایشیا کی تقدیر صرف اس بات پر مبنی ہے کہ ہم قومیت ہند کا اتحاد اسی اصول پر قائم کریں۔''

آگے چل کر کہا:

''میرا دل اب بھی امید سے لبریز ہے۔ واقعات کا رجحان بہرکیف ہمارے داخلی اتحاد اور اندرونی ہم آہنگی ہی کی جانب نظر آتا ہے اور جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے مجھے یہ اعلان کرنے میں تامل نہیں کہ اگر فرقہ وارانہ امور کے ایک مستقل اور پائیدار حل کے اس بنیادی اصول کو تسلیم کرلیا جائے کہ مسلمانان ہند کو اپنی روایات و تمدن کے ماتحت اپنے ہندوستانی مادر وطن کے اندر رہتے ہوئے آزادانہ نشوونما کا حق حاصل ہے تو وہ ہندوستان کی آزادی کے لیے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔''

آپ نے ون یونٹ کا صوبہ تجویز کرنے کے بعد آگے چل کر کہا کہ ''اس سے مسلمانوں میں احساس ذمہ داری مضبوط ہوگا اور جذبہ حب الوطنی فروغ پائے گا۔ اگر شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ بھرپور موقع دیا جائے کہ وہ ہندوستان کے نظام سیاست میں رہ کر نشوونما پاسکیں تو وہ ہندوستان کے خلاف تمام حملوں کی صورت میں، چاہے یہ حملہ بزور قوت ہو یا بزور خیالات، ہندوستان کے بہترین محافظ ثابت ہوں گے۔''

اس کے بعد آپ نے وفاق ہندوستان کے دفاع پر بڑی تفصیل کے ساتھ بحث کی اور کہا ''مجھے یقین ہے کہ وفاقی حکومت کے قیام کی صورت میں مسلم وفاقی ریاستیں ہندوستان کے دفاع کی خاطر غیر جانبدار بری اور بحری فوجوں کو قائم کرنے کے لیے بخوشی رضامند ہوجائیں گی۔ ہندوستان کے دفاع کے لیے اس قسم کی غیر جانبدار فوجی طاقت مغلیہ

دور حکومت میں موجود تھیں۔ اکبر کے زمانہ میں ان تمام سرحدی فوجوں کے افسر ہندو تھے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ ہندوستان کے وفاق پر مبنی ایک غیر جانبدار ہندوستانی فوج کے قیام سے مسلمانوں کی حب الوطنی میں اضافہ ہوگا۔''

علامہ نے اصل میں مسلم لیگ کے سرکاری موقف کے بارے میں کہ برصغیر میں ایک ڈھیلا ڈھالا وفاق قائم کیا جائے یہ خطبہ بہت تفصیل کے ساتھ پیش کیا۔ آپ نے اس میں صوبوں کی ازسرنو حد بندی کا جو مطالبہ کیا وہ بھی مسلم لیگ پہلے سے کر رہی تھی۔ اس خطبے میں آپ نے ایک جگہ سندھ اور بلوچستان کو باہم ضم کر کے ایک صوبہ بنانے کی بھی تجویز دی۔ آپ نے نہرو رپورٹ کی مجوزہ وحدانی طرز کی مضبوط مرکز کی حکومت کی مخالفت کی اور کہا کہ ''مسلمانوں کو اس وقت تک فائدہ نہیں ہوسکتا جب تک انہیں ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے پانچ میں تمام اختیارات مابقی کے ساتھ اکثریت کے حقوق حاصل نہ ہوں اور وفاقی مجلس قانون ساز میں 33 فیصد نشستیں نہ ملیں۔'' آپ نے مسلم اکثریت پر مبنی خودمختار ریاستوں یعنی صوبوں کے بارے میں یہ بھی کہا کہ ''ہندوؤں کے دلوں میں یہ خدشہ نہیں ہونا چاہیے کہ خودمختار مسلم ریاستوں کے قیام سے ان علاقوں میں ایک طرح کی مذہبی حکومتیں قائم ہوجائیں گی۔'' آپ نے اس کے لیے ٹائمز آف انڈیا کے اداریے کے حوالے سے بتایا کہ'' باوجودیکہ اسلام میں سود لینا حرام ہے، مسلم دور حکومت میں ہندوستانی مسلم ریاستوں نے شرح سود پر پابندی نہیں لگائی تھی۔''(2)

ان اقتباسات سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ علامہ اقبال نے اس خطبہ میں مسلمانوں کے علیحدہ وطن یعنی Sovereign State کے قیام کا کوئی تصور پیش نہیں کیا تھا۔ خود علامہ نے 1934ء میں اس کی تردید فرمائی جس کی تفصیل کچھ یوں ہے:

1932-30ء کے دوران گول میز کانفرنسوں کے انعقاد کے دوران کیمبرج کے طلبہ کے گروپ نے چودھری رحمت علی کی قیادت میں پمفلٹ شائع کیا جس میں پاکستان کے نام سے شمال مغربی ہندوستان میں مسلمانوں کے ملک کا نقشہ شائع کیا گیا تھا۔ 1934ء میں علامہ

اقبال کی کتاب رموزخودی کے انگریزی ترجمے پر ان کے پروفیسر ای۔جے۔تھامپسن نے تبصرہ کرتے ہوئے علامہ کے تعارف میں آپ کے خطبہ الہ آباد کو چودھری رحمت علی کی پاکستان کی تجویز سے منسلک کردیا۔ آپ نے یہ تبصرہ پڑھا تو جواب میں جو خط لکھا وہ پروفیسر تھامپسن کے خطوط کے مجموعہ میں شامل ہے جسے علی گڑھ یونیورسٹی نے شائع کیا ہے۔ آپ نے اس میں لکھا ''.....آپ نے ایک غلطی کی ہے جس کی میں فوری نشاندہی کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔کیونکہ یہ ایک فاش غلطی ہے۔آپ نے میرے بارے میں کہا ہے کہ میں اس سکیم کا حامی ہوں جسے پاکستان کہا جاتا ہے۔جبکہ پاکستان میری سکیم نہیں ہے۔ میں نے اپنے خطبے میں جو تجویز پیش کی تھی وہ ایک مسلم صوبہ کے بارے میں تھی۔ جو شمال مغربی ہندوستان کے مسلم اکثریتی آبادی پر مشتمل تھا۔ میری سکیم کے مطابق یہ نیا صوبہ مجوزہ انڈین فیڈریشن کا حصہ ہوگا۔ پاکستان سکیم میں مسلم صوبوں پر مشتمل ایک علیحدہ فیڈریشن کا قیام تجویز کیا گیا ہے.....اس سکیم نے کیمبرج میں جنم لیا ہے۔''(3)

یہ امر بھی خالی از دلچسپی نہیں ہے کہ خود قائداعظم محمد علی جناح نے اپنے کسی بیان میں اور مسلم لیگ نے اپنی کسی سرکاری قرارداد میں کبھی اس بات کا ذکر نہیں کیا کہ علامہ اقبال نے مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کا تصور پیش کیا تھا۔ 1938ء میں علامہ اقبال کا انتقال ہوا۔ دسمبر 1938ء کو مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ پٹنہ میں اس سال کے دوران وفات پانے والی تین معتبر شخصیات مولانا شوکت علی، کمال اتاترک اور علامہ اقبال کے بارے میں قائداعظم نے اپنے صدارتی خطبہ کے اختتام پر تعزیتی الفاظ کہے۔ آپ نے علامہ کے بارے میں فرمایا:

"His death too, is an irreparable loss to Muslim India. He was personal friend of mine and a singer of the finest poetry in the world. He will live as long as Islam will live. His able poetry interprets the true aspiration of the Muslims of India. It will remain

an inspiration for us and for generations after us".(4)

ترجمہ: ''ان کی وفات مسلم ہند کے لئے ناقابل تلافی نقصان ہے۔وہ میرے ذاتی دوست تھے اور دنیا کی عمدہ ترین شاعری کے مغنی تھے۔وہ اس وقت تک زندہ رہیں گے جب تک اسلام زندہ ہے۔آپ کی پرمغز شاعری مسلمانان ہند کی امنگوں کی سچی ترجمانی کرتی ہے۔یہ شاعری ہمارے لئے اور ہمارے بعد کی نسلوں کے لئے ولولہ مہیا کرتی رہے گی۔''

آپ نے ان کی شاعری'اسلام سے وابستگی اور ذاتی دوستی کے حوالے سے خراج تحسین پیش کیا۔ علامہ کے بارے میں بطور سیاست دان یا فلسفی کے کچھ نہیں کہا اور مسلمانوں کے علیحدہ وطن کے تصور کے خالق کا تو دور دور کوئی ذکر نہیں ہے۔

اسی اجلاس میں مسلم لیگ نے تعزیتی قرارداد بھی منظور کی۔ اس میں بھی آپ کو اسلام کے سنجیدہ فلسفی "a sage philosopher of Islam"اور عظیم قومی شاعر "great national poet" کی حیثیت سے خراج تحسین پیش کیا گیا۔((5 گویا گزشتہ 8 سال سے لیگ کو یہ علم نہیں تھا کہ علامہ نے مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کا تصور پیش کر رکھا ہے اور اس حوالے سے آپ کا اعتراف کیا جانا چاہئے۔حقیقت یہ تھی کہ ایسا تھا ہی نہیں۔

مارچ 1940ء میں لاہور کا مسلم لیگ کا اجلاس جس میں پہلی بار مسلم لیگ نے مسلمانوں کے اکثریتی علاقوں پر مبنی مکمل آزاد مملکتوں Sovereign States کے قیام کا مطالبہ کیا، اس جلسے میں قائداعظم سمیت کسی مقرر نے علامہ اقبال کا ذکر تک نہیں کیا۔ چہ جائیکہ ان کا تصور پاکستان کے خالق کی حیثیت سے کوئی ذکر کیا جاتا۔ حالانکہ جس جگہ پر جلسہ ہو رہا تھا وہاں سے نصف کلومیٹر سے بھی کم فاصلے پر علامہ اقبال کا مزار ان دنوں زیر تعمیر تھا۔ یہاں یہ بتانا بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ قائداعظم نے اپنی طویل افتتاحی تقریر میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کے مطالبے کی حمایت میں ماضی کا جو حوالہ دیا وہ پنجاب کے مہاسبھائی لیڈر لالہ لاجپت رائے کا تھا جس نے 1924ء میں اخبار ٹریبیون میں اپنے ایک مضمون میں

برصغیر کی فرقہ وارانہ بنیاد پر تقسیم کی سکیم پیش کی تھی۔ غالباً یہ برصغیر میں پہلی بار تھا کہ ایسی کوئی سکیم پیش کی گئی تھی۔ اس کی سکیم یہ تھی کہ ''مسلمانوں کی چار ریاستیں ہوں گی۔ (1) پٹھانوں کا صوبہ یا شمال مغربی سرحد۔ (2) مغربی پنجاب (3) سندھ اور (4) مشرقی بنگال۔ یہ متحدہ ہندوستان نہیں ہوگا۔ ہندوستان واضح طور پر مسلم انڈیا اور غیر مسلم انڈیا میں تقسیم ہوگا۔'' (6)

قائداعظم نے مارچ 40ء کے جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے انہی دنوں چھپی اندر پرکاش کی کتاب نکال کر پیش کی جس میں لالہ لاجپت رائے کا ایک خط شامل تھا جو اس نے 16 رجون 1925ء کو کانگرس کے صدر سی۔ آر۔ داس کو لکھا تھا۔ قائداعظم نے یہ پورا خط پڑھ کر سنایا جس میں لاجپت رائے نے جو لکھا اس کا لب لباب یہ تھا کہ ''میں مسلمانوں کی تاریخ اور فقہ پڑھ کر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ہندو اور مسلمان اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ آپ کو ہمارے لیے کوئی راہ نجات نکالنی چاہیے۔'' (7)

مولوی اے کے فضل الحق نے قرارداد پیش کی تو اس کی تائید میں چودھری خلیق الزمان کے علاوہ مولانا ظفر علی خان نے بھی تقریر کی۔ ان کے علاوہ جن اصحاب نے تقریر کی ان میں سردار اورنگ زیب (سرحد)، سر عبداللہ ہارون (سندھ)، نواب محمد اسماعیل (بہار)، محمد عیسیٰ خان (بلوچستان)، عبدالحمید خاں (مدراس)، اسماعیل چندریگر (بمبئی)، عبدالروٗف شاہ (سی پی) اور ڈاکٹر محمد عالم شامل تھے۔ ڈاکٹر عالم نے کہا کہ ایسی ہی سکیم غدر پارٹی کے بھائی پرمانند نے 14-1915ء میں بھی پیش کی تھی۔ (8) لاہور کے رہنے والے مولانا ظفر علی خان سمیت کسی ایک بھی مقرر نے یہ حوالہ نہ دیا کہ مسلمانوں کے علیحدہ وطن کا تصور علامہ اقبال نے 10 سال پہلے پیش کیا تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ ان لوگوں کی یادداشت کمزور تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ ایسا تصور علامہ کی طرف سے پیش ہوا ہی نہیں تھا۔

میں نے 1940ء سے 1947ء میں قیام پاکستان تک مسلم لیگ کے تمام اجلاسوں کی کاروائیوں کا بغور مطالعہ کیا۔ 1942ء میں مسلم لیگ نے لفظ پاکستان کو قرارداد لاہور کے ساتھ منسلک کرلیا۔ پھر 45-1946ء کے انتخابات میں مطالبۂ پاکستان مسلم لیگ کے انتخابی

منشور کا حصہ بن گیا۔لیکن ان سات برس کی تمام کاروائیوں میں کسی ایک جگہ بھی اس مطالبے کو علامہ اقبال کے ساتھ منسوب نہیں کیا گیا۔ حالانکہ 1943ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ کراچی میں انورقریشی نے جلسہ کے شروع میں ترانہ ''چین و عرب ہمارا، ہندوستان ہمارا'' پڑھ کر سنایا اور اسی اجلاس میں جی ایم سید نے اپنی تقریر میں علامہ اقبال کے اشعار کا استعمال کیا اور پھر قائداعظم نے صدارتی تقریر کی۔مگر علامہ کا تصور پاکستان کے خالق کے طور پر کسی نے ذکر نہ کیا۔[9] 1947ء میں قیام پاکستان کے وقت اور اس کے بعد اپنے انتقال ستمبر 1948ء تک اپنے کسی بیان میں قائداعظم نے اس جانب اشارہ تک نہیں کیا کہ یہ جو پاکستان وجود میں آیا ہے دراصل'' اس کا خواب علامہ اقبال نے دیکھا تھا''۔ گویا ''خواب کی تعبیر'' کرنے والے نے'' خواب دیکھنے'' والے کا کبھی ذکر نہیں کیا حالانکہ اس دوران 21 اپریل 1948ء کو یوم اقبال بھی آیا جسے اس وقت تک سرکاری طور پر نہیں منایا جاتا تھا۔لوگ اپنے طور پر منایا کرتے تھے۔

یہ بات تحقیق طلب ہے کہ اقبال کو تصور پاکستان کے خالق کے طور پر کب اور کہاں شروع کیا گیا۔ غیرسرکاری طور پر پنجاب کے مسلم لیگی حلقوں میں 45-1946ء کے انتخابات کے دوران اس کا ذکر شروع کر دیا گیا تھا۔ اس میں لاہور کا اخبار نوائے وقت پیش پیش تھا۔لیکن سرکاری طور پر پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ نے یہ سلسلہ بہت بعد میں شروع کیا۔ اس سلسلے میں اہم کردار پنجابی بیوروکریسی نے ادا کیا جس کے سرغنہ چوہدری محمد علی، سیکرٹری جنرل حکومت پاکستان اور وزیر خزانہ ملک غلام محمد تھے اور میڈیا میں حمید نظامی کا ادارہ نوائے وقت جو دراصل پنجابی شاونزم کا ترجمان تھا اور پنجابی فوج اور افسر شاہی کی سیاسی نظریہ سازی کیا کرتا تھا۔ ان پنجابی شاونسٹوں کی سیاسی ترجمانی نواب مشتاق گورمانی اور نواب افتخار حسین ممدوٹ کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اردو بولنے والوں میں خود وزیر اعظم لیاقت علی خان اور وزراء ڈاکٹر محمود حسین اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی بھی نظریہ سازی کے لئے اقبال کو استعمال کرنے کا کام شروع کر چکے تھے۔ قیام پاکستان پر دو اہم کتابیں شائع

ہوئیں ۔ایک چوہدری محمد علی کی Emergence of Pakstan اور دوسری ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی The Struggle for Pakistan۔ ان دونوں حضرات نے نظریہ پاکستان کی مذہبی بنیادوں پر اسلامی نظام کی تجربہ گاہ کے تھیسس کو پروموٹ کیا۔ پنجابی اور مہاجر شاونسٹوں، دونوں کی یہ سیاسی ضرورت تھی۔ مہاجروں کا زمین سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ اس لئے وہ جغرافیائی سرحدوں کے بجائے نظریاتی سرحدوں کے نام پر یہاں اپنی سلطنت قائم کرنا چاہتے تھے۔ پنجابی بنگالیوں کے مقابلے میں اپنی عددی کمی کو کسی بھی سیکولر ریاست کے ڈھانچے میں، جو قائداعظم کے دستور سازی کے تصور پر مبنی ہوتی، ایک غالب قوت میں نہیں بدل سکتے تھے۔ چنانچہ نظریہ پاکستان کی ان کو بھی بڑی شدید ضرورت تھی جس کے لئے پنجابی علامہ اقبال سب سے موزوں شخصیت ہو سکتے تھے۔

1938ء میں سندھ مسلم لیگ پراونشل پارٹی نے جی۔ایم۔سید اور مولانا عبدالمجید سندھی کی قیادت میں یہ قرارداد پہلی بار منظور کی تھی کہ مسلمانوں کا الگ وطن ہونا چاہیے۔ لیکن اس کا کوئی ذکر نہیں کرتا کیونکہ جی ایم سید کا قائداعظم کے ساتھ 46ء کے انتخابات کیلئے انتخابی ٹکٹوں کی تقسیم پر اختلاف ہوا اور سید ہمیشہ کے لئے لیگ کا مخالف ہو گیا۔ یہاں تک کہ بعد میں قیام پاکستان کا بھی مخالف ہو گیا۔ تاہم تاریخی حقیقت کے طور پر سندھ پراونشل مسلم لیگ کی قرارداد جو 40ء سے پہلے اور لیگ کے پلیٹ فارم سے اپنی نوعیت کی پہلی قرارداد تھی، ان نظریہ سازوں کو کبھی نظر نہ آئی کیونکہ یہ سندھ سے ہوئی تھی اور نظریہ سازی اپنے اپنے مفاد کے لئے پنجابی اور مہاجر کر رہے تھے۔

یہ تاریخی مغالطہ دور کرنا ضروری تھا۔ اس لیے بحث بہت دور تک چلی گئی۔ بتانا صرف یہ تھا کہ قیام پاکستان نظریوں یا تصورات یا خوابوں کے نتیجے میں وجود میں نہیں آیا تھا۔ یہ خواب اور نظریئے بعد کی پیداوار ہیں۔ پاکستان دراصل برصغیر میں ہندو۔مسلم۔انگریز کی جدلیات کی مثلث میں جو کشمکش چل رہی تھی، اس کے نتیجے میں ایک انجام تک پہنچا تھا۔ قائداعظم کے دوقومی نظریئے یا تھیوری کو بھی ان نظریہ سازوں نے اپنے مقاصد کے لئے

استعمال کیا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے سیاسی مسئلے کو ایک ڈھیلے ڈھالے آل انڈیا وفاق میں رہتے ہوئے حل کرنے کو تقسیم کے مقابلے میں ترجیح دی تھی اور آخر وقت تک اس کے لئے کوشش کرتے رہے۔ اس کی مختصر تفصیل یہ ہے۔

دوسری عالمی جنگ کے اختتام تک انگریزوں کا دیوالیہ ہو چکا تھا اور انگریز نے برصغیر سے بستر گول کرنے کا بگل بجا دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہندو۔ مسلم۔ انگریز کی جدلیات کی مثلث کے تین نقطوں کے مابین کشمکش تیز ہوگئی تھی۔ ان تینوں کی ترجیحات یہ تھیں:

1- انگریز: ہر قیمت پر برصغیر کو متحد اکائی کے طور پر چھوڑ کر جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے ڈیڑھ سو برس کی کوشش سے جو سول اور فوجی ڈھانچہ کھڑا کیا تھا وہ اسے متحد اس لیے چھوڑنا چاہتے تھے کہ عالمی جنگ کے اختتام پر سوویت یونین اور ابھرتا ہوا چین کا کمیونسٹ انقلاب برصغیر میں داخل نہ ہو سکے کہ اس کے بعد خلیج، مشرق وسطیٰ، مشرق بعید اور افریقہ تک اس کا راستہ روکنا بہت مشکل ہو جاتا۔

2- ہندو: کانگرس کے سیکولرازم کے بینر کے تحت پورے برصغیر پر مضبوط مرکزی حکومت کے ذریعہ مکمل اور بلاشرکت غیرے کنٹرول حاصل کرنا چاہتے تھے۔

3- مسلمان: ہر حال میں مسلم اکثریتی صوبوں کو ہندوؤں یعنی کانگرس کے مضبوط مرکزی کنٹرول سے آزاد رکھنا چاہتے تھے اور زیادہ سے زیادہ مکمل علاقائی خودمختاری چاہتے تھے۔

یہ کشمکش 1944ء میں لارڈ ویول کی جانب سے گاندھی۔ جناح ملاقاتوں کے اہتمام اور پھر تمام رہنماؤں کی شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد اس وقت نئے موڑ میں داخل ہوگئی جب نئی لیبر حکومت کے وزیراعظم ایٹلی نے 45-1946ء میں انتخابات کا اعلان کر دیا اور 48ء میں انتقال اقتدار کی تاریخ دے دی۔ ان انتخابات میں مسلم لیگ تمام صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں میں مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت بن کر ابھری۔ مارچ 46ء میں حکومت برطانیہ نے انتقال اقتدار کا فارمولا طے کرنے کے لیے تین وزیروں لارڈ پیتھک

لارنس، سٹیفورڈ کرپس اور اے۔ وی۔ الیگزینڈر کو ہندوستان بھیجا۔ انہوں نے تین ماہ تک تمام سیاسی رہنماؤں کے ساتھ طویل مذاکرات کیے اور بالآخر مئی 46ء میں ایک آئینی منصوبہ پیش کیا جسے وزارتی مشن منصوبہ کہا جاتا ہے۔ اس میں دستور ساز اسمبلی بنانے کا خاکہ دیا گیا تھا اور جن سیاسی جماعتوں کو یہ قبول تھا انہیں عبوری حکومت میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی تھی۔ دستور سازی کا خاکہ تین گروپوں یا زونوں پر مشتمل تھا۔ جن میں ان صوبوں کو شامل کیا گیا تھا۔

گروپ A ۔ مدراس، بمبئی، یوپی، بہار، سی پی، اڑیسہ۔

گروپ B ۔ پنجاب، سرحد، سندھ

گروپ C ۔ بنگال، آسام۔

یہ ایک ڈھیلے ڈھالے وفاق کی سکیم تھی جس میں مرکز کے پاس دفاع، خارجہ، مواصلات اور ان محکموں کے لیے درکار آمدنی کے حصول کے اختیارات تھے۔ باقی سب اختیارات گروپ (زون) اور صوبائی سطح پر منتقل (Devolve) کر دیئے گئے تھے۔ اسے گروپنگ سکیم یا زونل سکیم کہا جاتا تھا۔ اس آئینی منصوبے کے دیباچہ میں پاکستان کی سکیم کو ناقابل عمل قرار دے کر رد کر دیا گیا تھا۔ تاہم جناح نے باوجود اس کے کہ لیگ نے مطالبہ پاکستان پر انتخاب جیتا تھا، مسلم لیگ کی طرف سے اس منصوبے کو منظور کر لیا اور انہوں نے کہا کہ دراصل یہ ہی پاکستان ہے۔

یاد رہے کہ ایک اور نعرے کو نظریہ سازوں نے استعمال کیا ہے کہ ''پاکستان کا مطلب کیا لا الہ اللہ'' اور یہ کہا جاتا ہے کہ یہ نعرہ گلی گلی اور مسلم لیگ کے ہر جلسے میں لگایا جاتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ نعرہ فقط ایک مرتبہ لگا اور وہ مسلم لیگ کا جلسہ نہیں تھا بلکہ جمعیت المشائخ کے جلسہ منعقدہ موچی دروازہ لاہور میں پیر جماعت علی شاہ نے مسلم لیگ کی 46ء کے انتخابات میں حمایت کیلئے لگایا تھا۔ یہ نعرہ یا اس سے ملتا جلتا کوئی نعرہ مسلم لیگ کے کسی جلسہ میں یا کسی رسمی اجلاس میں یا قرارداد میں شامل نہیں ہوا۔ مشائخ یا صوفیا جو عوام الناس کے زیادہ قریب تھے، پاکستان کے حامی تھے۔ جبکہ ملاؤں کی مذہبی سیاسی جماعتیں اس کی بڑھ

چڑھ کر مخالفت کر رہی تھیں۔ ان میں مجلس احرار، جمیعت علمائے ہند، جماعت اسلامی، آل انڈیا شیعہ کانفرنس، آل انڈیا مومن کانفرنس، خاکسار تحریک شامل تھے۔ ایک احراری ملا مظہر علی اظہر جلسوں میں قائداعظم کے بارے میں یہ شعر پڑھا کرتا تھا۔

اک کافرہ کے واسطے اسلام کو چھوڑا یہ قائداعظم ہے کہ ہے کافر اعظم

تاہم 46ء کا انتخاب پاکستان کے نام پر جیتنے کے باوجود قائداعظم وزارتی مشن منصوبہ کی مجوزہ زونل یا گروپنگ پر مبنی کل ہند کے دائرے میں رہتے ہوئے آئین کو قبول کر چکے تھے۔لیکن کانگرس نے دستورساز اسمبلی کے قیام اور انتقال اقتدار کی باقی سب شقوں کو تو منظور کرلیا مگر گروپنگ سکیم یا زونل سکیم کو رد کردیا۔ مسلم لیگ جو کسی مخصوص نظریے کے تجربے کے لیے مملکت کے حصول پر کام نہیں کررہی تھی بلکہ وہ اب بھی ہندوستان کے دائرے میں رہتے ہوئے ایک ڈھیلے ڈھالے وفاق کو قبول کررہی تھی، کو شدید مایوسی ہوئی۔ اس پر کانگرس کے صدر ابوالکلام آزاد کو بھی بہت مایوسی ہوئی تھی کیونکہ آزاد کے مطابق یہ ایک بہترین حل تھا مگر اس منصوبے کو نہرو نے سبوتاژ کردیا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ گاندھی اور پٹیل بھی اسے سبوتاژ کرنے میں برابر کے شریک تھے۔ اصل بات یہ تھی کہ کانگرس ڈھیلے ڈھالے وفاق کی بجائے مضبوط مرکز کے ذریعے ہندوستان پر گرفت مضبوط کرنا چاہتی تھی۔ اگرچہ اس نے مشن منصوبہ مکمل منظور نہ کیا تھا مگر اسے عبوری حکومت میں شامل کرلیا گیا۔

کانگرس کی طرف سے گروپنگ سکیم کے رد کیے جانے کے بعد مسلم لیگ نے بھی اپنے فیصلے کو واپس لے لیا اور ڈائریکٹ ایکشن کا اعلان کردیا۔ 16/اگست کو ڈائریکٹ ایکشن ڈے منایا گیا اور پورے برصغیر میں ہندو۔مسلم فسادات پھوٹ پڑے۔ صرف کلکتہ میں تین دن میں پچاس ہزار سے زائد افراد ہلاک و زخمی ہوئے اور پھر یہ سلسلہ نہ رک سکا۔ تین چار ماہ تک نواکھلی سے لے کر بہار اور گڑھ مکتیشر تک خون کے دریا بہا دیئے گئے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں کے ہزاروں افراد لقمہ اجل بن گئے۔

مسلم لیگ، جسے عبوری حکومت سے اس لیے باہر رکھا گیا تھا کہ اس نے مشن

منصوبہ کی منظوری واپس لے لی تھی، مگر فسادات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتحال کی وجہ سے اکتوبر 46ء میں لیگ کو بھی عبوری حکومت میں شامل کرلیا گیا۔ اس حکومت میں آئے دن کانگرس اور لیگ کے وزراء کے مابین چپقلش جاری رہتی تھی۔

دسمبر 46ء تک برطانوی حکومت اور کانگرس میں یہ طے پا گیا کہ انتقال اقتدار کانگرس کی Terms پر کردیا جائے گا۔ لارڈ ویول کو، جو ابھی تک وزارتی مشن منصوبے پر عملدرآمد کی کوشش کررہا تھا اور کانگرس کو انتہائی ناپسند تھا، برطرف کردیا گیا۔ اس کی جگہ کانگرس کی منشاء سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے تقرر کا اعلان کردیا گیا۔ جناح نے مشن منصوبے کی مجوزہ گروپنگ سکیم کو بچانے کے لیے ایک آخری کوشش کے طور پر دسمبر 46ء میں لندن کا دورہ کیا۔ وہ خونریز مسلم کش فسادات کے باوجود اب بھی متحدہ ہندوستان کے دائرے میں رہتے ہوئے ایک ڈھیلے ڈھالے وفاق کو پاکستان کی سکیم سے بہتر سمجھتے تھے۔ لیکن اس ضعیف العمری اور سخت سردی میں دسمبر کے لندن دورے کے دوران برطانوی حکام نے انہیں بتا دیا کہ گروپنگ سکیم اب قصہ پارینہ ہوچکی ہے۔ اس دوران نہرو بھی مختصر دورے پر لندن بلایا گیا تھا۔

مارچ 47ء میں نیا وائسرائے ماؤنٹ بیٹن انتقال اقتدار کے آخری راؤنڈ کے لیے دہلی پہنچا۔ اس کا رویہ جناح اور لیگی رہنماؤں کے ساتھ انتہائی رعونت آمیز اور معاندانہ تھا جبکہ کانگرسی رہنماؤں، خصوصاً نہرو کے ساتھ، بہت گہرے تعلقات تھے۔ اس نے اپریل اور مئی دو ماہ میں حالات کا جائزہ لیا اور تمام سیاسی رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں۔ وہ ان ملاقاتوں میں پاکستان کے لیے ''پاگل پاکستان'' کا لفظ استعمال کیا کرتا تھا۔ اس لیے کہ جو پاکستان وہ دینا چاہتا تھا وہ ایک کٹا پھٹا پاکستان تھا۔

یکم مئی 47ء کو کانگرسی مجلس عاملہ نے برصغیر کی تقسیم کی منظوری دے دی۔ جس میں پنجاب اور بنگال کو بھی تقسیم کیا گیا تھا۔ منقسم پنجاب اور منقسم بنگال پر مبنی پاکستان کو قائداعظم ہمیشہ نامنظور کیا کرتے تھے۔ وہ اسے کٹا پھٹا، کرم خوردہ اور ناقابل عمل قرار دیتے تھے۔ کانگرس بھی ایسا ہی سمجھتی تھی اور ایک کمزور پاکستان دے کر وہ باقی پورے ہندوستان پر ایک

مضبوط مرکز کے تحت کنٹرول حاصل کرنے جارہی تھی۔ اس سلسلہ میں 10-7 رمئی کے دوران ماؤنٹ بیٹن اور نہرو شملہ چلے گئے۔ نئی دہلی میں وائسرائے کے چند قریبی افسروں کے علاوہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ یہ دونوں حضرات شملہ میں کیا کر رہے ہیں اور جناح کو کانون کان خبر نہ تھی کہ شملہ میں کیا کھچڑی پکائی جارہی ہے۔

تقسیم کے منصوبے کا ڈرافٹ ڈومینین کی بنیاد پر شملہ کے سیسل ہوٹل میں وی۔ پی مینن نے ماؤنٹ بیٹن اور نہرو کی ہدایات کے مطابق تیار کیا۔ یہ بھی فیصلہ کرلیا گیا کہ انتقال اقتدار 48ء کے بجائے اگست 47ء میں ہی کردیا جائے گا۔ تقسیم کی ساری تفصیل، باؤنڈری لائن تک نہرو اور ماؤنٹ بیٹن کے مابین طے ہوئی۔ جس کی منظوری ماؤنٹ بیٹن لندن سے لے کر آیا اور 3/جون 47ء کو پارٹیشن ایوارڈ کا اعلان کردیا گیا۔ ((10)

قائداعظم کے پاس اسی پاکستان کو قبول کرلینے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا جسے وہ ہمیشہ کٹا پھٹا، کرم خوردہ اور ناقابل عمل قرار دیا کرتے تھے۔ تاہم انہوں نے ایک کوشش اور کی کہ پنجاب اور بنگال تقسیم نہ ہوں۔ ان کا خیال تھا کہ کلکتہ کے بغیر مشرقی بنگال معاشی طور پر چل نہیں سکے گا۔ انہوں نے سکھ رہنماؤں کو بہت یقین دہانی کرائی اور گیانی کرتار سنگھ مان بھی گیا مگر ماسٹر تارا سنگھ نہ مانا اور یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ البتہ بنگال کی تقسیم روکنے کی جو کوشش ہوئی اس میں قدرے کامیابی کی امید پیدا ہوئی۔ حسین شہید سہروردی، جو متحدہ بنگال کے مسلم لیگی وزیراعلیٰ تھے، قائداعظم کی اشیرباد سے بنگال کے فارورڈ بلاک کے رہنما سرت چندر بوس اور بنگال پراونشل کانگرس کے صدر کرن شنکر رائے کو بنگال کو متحد رکھنے پر قائل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ تجویز یہ تھی کہ متحدہ بنگال ایک الگ تیسرا آزاد ملک بن جائے۔ سہروردی نے بنگال کے رہنماؤں کو قائل کرنے کے بعد ماؤنٹ بیٹن کو اس تجویز سے آگاہ کیا۔ ماؤنٹ بیٹن نے پوچھا کہ جناح کی اس بارے میں کیا رائے ہے تو سہروردی نے بتایا کہ یہ ان کی اشیرباد سے ہی طے ہوا ہے۔ اس کے بعد ماؤنٹ بیٹن نے جناح کے ساتھ ملاقات میں ان سے اس بابت دریافت کیا تو جناح بولے کہ" ہمیں آزاد متحدہ بنگال کے

بننے پر خوشی ہوگی۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے ان کے ساتھ بہت اچھے تعلقات ہوں گے۔''
یاد رہے متحدہ بنگال کی اس ریاست کا نام سوشلسٹ ری پبلک آف بنگال تجویز کیا گیا تھا۔ لیکن گاندھی، نہرو اور پٹیل نے بنگال کانگرس کی قیادت کو سہروردی کے ساتھ اس قسم کی تجویز پر اتفاق کرنے پر سخت برہمی کا اظہار کیا اور اسے کامیاب نہ ہونے دیا۔ (11)

اب تک کی بحث سے یہ ظاہر ہوا کہ قائداعظم کسی مخصوص نظریے کی تجربہ گاہ کے لیے ملک بنانے نہیں جارہے تھے۔ وہ اس وقت ہی آزاد اور متحدہ بنگال (یعنی بنگلہ دیش) بنانے پر آمادہ ہوگئے تھے۔ وہ ایک حقیقت پسند pragmatic سیاست دان تھے۔ وہ کسی تھیوکریٹک ریاست کے قیام کے سخت خلاف تھے۔ جب 14/اگست کو ملک کا قیام عمل میں آیا تو ان کے ہر بیان اور ہر عمل سے یہ بات ظاہر ہوئی۔ مگر بنگال اور پنجاب کی تقسیم نہ رک سکی۔ باؤنڈری کمیشن محض برائے نام بنایا گیا تھا۔ لکیر کہاں ڈالی جائے گی۔ یہ فیصلہ نہرو اور ماؤنٹ بیٹن پہلے ہی کر چکے تھے۔ لیکن باؤنڈری کمیشن کے ایوارڈ کا اعلان دونوں ملکوں کے وجود میں آنے کے تین دن بعد 17/اگست کو ہوا۔ مشرقی پنجاب بالخصوص وہاں کے دیہاتوں میں رہنے والے مسلمانوں کو یہ پتہ ہی نہ تھا کہ ان کا علاقہ پاکستان میں ہوگا۔ ان پر اچانک سکھوں کے حملوں سے جو قیامت ٹوٹی اس سے معلوم پڑا کہ وہ دشمن کے علاقے میں ہیں۔ پنجاب کے دونوں حصوں میں جو قتل عام، خونریزی اور تباہی ہوئی اس کی تفصیل سے آپ سب واقف ہیں۔ لیکن صرف یہ کہوں گا کہ پنجاب کے دونوں طرف کے لوگوں کا یہ چوائس نہیں تھا کہ یہ خونریزی ہو۔ ان پر تاریخ کی جدلیات کا جبر ٹوٹا تھا جس سے بچنا شاید ان کے اختیار میں نہیں تھا۔ کانگرس کی تنگ نظر قیادت اور برطانوی سامراج تھوڑی دانش مندی کا مظاہرہ کرتے اور ڈھیلے ڈھالے وفاق پر مبنی گروپنگ سکیم کے تحت انتقال اقتدار کر دیتے تو یہ عذاب نہ ٹوٹتا اور ضلع گورداسپور اور فیروزپور میں غیر منصفانہ طریقے سے باؤنڈری ڈال کر مسئلہ کشمیر کی شکل میں جو ناسور پیدا کیا گیا، اس سے بھی نجات مل جاتی۔ دونوں ملک Security States کی حیثیت سے اپنا اربوں ڈالر کا بجٹ دفاع پر خرچ کر رہے ہیں، شاید

اس سے بھی بچت ہوجاتی۔

تقسیم کے بعد بھی برصغیر میں قوتوں کے مابین کشمکش کی جدلیات بدستور جاری رہی۔ ہندو۔مسلم تضاد، پاک۔ بھارت تنازعہ کی شکل اختیار کر گیا۔ دونوں ملکوں کے مابین تین جنگیں ہوئیں۔ ایٹمی دوڑ شروع ہوئی۔ اُدھر سے اگنی اور پرتھوی داغے جاتے، ادھر سے غزنوی اور غوری۔ پاکستان کے اندر، جو بنیادی طور پر صوبائی خودمختاری کی تحریک کی بدولت وجود میں آیا تھا، جب یہاں ''نظریہ پاکستان'' اور ''نظریاتی تجربہ گاہ'' کا نام لے کر ان صوبائی حقوق کو سلب کرلیا گیا تو پھر یہ جدلیات اگلے مرحلے میں داخل ہوکر 71ء میں ایک اور تقسیم کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ جس طرح ''انڈین نیشنلزم'' کا نظریہ 1947ء کی تقسیم کو نہیں روک سکا تھا، ویسے ہی ''نظریہ پاکستان'' 71ء کی تقسیم کو نہ روک سکا۔ 47ء سے پہلے انڈین نیشنلزم کے علمبردار کہتے تھے، کوئی ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی نہیں سب ہندوستانی ہیں اور یہ کہہ کر وہ مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے حقوق کی نفی کرتے تھے ویسے ہی قیام پاکستان کے بعد کہا گیا کہ کوئی بنگالی، سندھی، بلوچی، پٹھان اور پنجابی نہیں، سب پاکستانی اور مسلمان ہیں اور یہ کہہ کر بنگالیوں، سندھیوں، بلوچوں اور پٹھانوں کے حقوق کی نفی کی گئی۔ مگر تاریخ کی جدلیات نے ثابت کیا کہ نظریے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں، جدلیاتی قوتیں اپنا راستہ بنا لیتی ہیں اور تاریخ آگے بڑھ جاتی ہے۔ ادھر پاکستان کے یوم آزادی پر بلوچستان میں کالے جھنڈے لہرائے جاتے ہیں۔ اُدھر کشمیر میں یوم آزادی پر ہمیشہ پاکستانی جھنڈے لہرائے جاتے ہیں۔ آج پاکستان اور ہندوستان کے حکمرانوں کو نظریئے کے شکنجے سے نکل کر حالات کی جدلیات کی حقیقت کا ادراک کرنا چاہیے۔ ورنہ سرحدیں اور ملک نظریوں کے مرہون منت نہیں ہوا کرتے۔

حواشی

1- Al-Beruni, Abu Rehan, *Indica*, Translated by Edward Sachau, Munshiram Manoharlal Publishers, New Delhi, 3rd Edition 1992, pp.17-24.

2- (i) For complete orignal text of Allama Iqbal's presidential address in English in the Annual Session of All India Muslin League at Allahabad, December 1930, See.

(i) *Foundations of Pakistan, All India Muslim League Documents: 1906-1947*, Edited by Syed Sharifuddin Pirzada, Vol II (1924-47), National Publishing House, Karachi, 1970, pp. 154-171.

(ii) Syed Abdul Vahid, *Thoughts and Reflections of Iqbal*, Sh. Muhammad Ashraf, Lahore, 1973, pp.161-194

(iii) اردو میں علامہ اقبال کے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الہ آباد، 1930ء کے خطبہ صدارت کا مکمل متن دیکھئے۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ۔جلد 5۔ مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقاء (1947-1849ء)۔ زاہد چودھری/حسن جعفر زیدی۔ ادارہ مطالعہ تاریخ۔ 1991ء۔ ص ص 395-417

3- S.Hassan Ahmad, *Iqbal: His Political Ideas at Cross Roads*, Print Well Publications, Aligarh 1979, p.80 (p.94)

اردو متن کے لیے دیکھئے۔ زاہد چودھری/حسن جعفر زیدی۔ محولہ بالا ص 418

4- *Foundations of Pakistan*, *op, cit*, see 26th session. Patna, 1938, p.303

5- *Ilid* . p 303

6- M.H. Saiyid, *Mohammed Ali Jinnah, A Political Study*, Elite Publisher, Karachi, 2nd Ed. Reprinted 1962, p.109

7- *Foundation of Pakistan, op.cit*, 27th session, Lahore 1940, pp. 335-336

8- *Ibid.* pp. 343-345

9- *Ibid.* pp. 442-448

10- 44ء سے 47ء تک انگریز، کانگرس اور مسلم لیگ کے مابین جدلیات کی تفصیل جس میں مشن منصوبہ کی مجوزہ گروپنگ سکیم کے لئے قائداعظم محمد علی جناح کی کوششوں اور کانگرس کی جانب سے اسے ناکام بنا کر ایک مضبوط مرکز کے تحت ہندوستان کے وسیع علاقے پر اپنا اقتدار قائم کرنے کی خاطر تقسیم ہند کو اپنی منشا کے مطابق منوانے کی کانگرس کی کوششوں اور انگریزوں سے تعاون کی تفصیل کے لیے دیکھئے۔ زاہد چودھری/حسن جعفر زیدی۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ۔ پاکستان کیسے بنا؟ دو جلدیں ۔ ادارہ مطالعہ تاریخ لاہور۔ 1989ء۔

11- تفصیل کے لیے دیکھئے۔ زاہد چودھری/حسن جعفر زیدی۔ محولہ بالا۔ جلد 2 ص ص 330-323،281-278

ضیاء الحق کے مارشل لاء کا تاریخی پس منظر

(حلقہ ارباب ذوق لاہور کے خصوصی اجلاس 3/جولائی 2011ء بعنوان ''وہ جو مزاحم ہوئے'' میں پڑھا گیا)

ضیاء دور کو بجا طور پر پاکستانی تاریخ کا سیاہ ترین دور کہا جاتا ہے۔ رجعت پسند قوتوں نے ریاست کی پوری فوجی طاقت کو بروئے کار لاتے ہوئے عوام الناس پر بدترین آمریت مسلط کی۔ اسلام اور نظریہ پاکستان کے نام پر ہر قسم کے ظلم اور جبر کو جائز قرار دیا گیا۔ پاکستان کی سول اور فوجی اسٹیبلشمنٹ نے پاکستان کے قائم ہوتے ہی مذہب کو ملک میں ہر قسم کی ترقی پسندی، آزادی فکر و اظہار اور تخلیقی قوتوں کو دبانے کے لئے استعمال کرنے کا جو عمل شروع کیا تھا، ضیاء دور میں وہ اپنی انتہا تک پہنچ گیا تھا۔ اس کی ابتدا تو اسی وقت ہو گئی تھی جب قائداعظم کی 11/اگست 1947ء کو دستور ساز اسمبلی کے افتتاحی اجلاس میں کی گئی تقریر کے بارے میں اسٹیبلشمنٹ کی طرف سے پریس ایڈوائس جاری کی گئی تھی کہ اس تقریر کے وہ حصے حذف کر دیئے جائیں جن میں آپ نے مذہب کو افراد کا ذاتی معاملہ قرار دیا تھا اور وا شگاف اعلان کیا تھا کہ مذہب کا سیاست اور کاروبار حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہو گا۔ لیکن روز نامہ ڈان کے ایڈیٹر الطاف حسین نے مزاحم ہو کر اس تقریر کے یہ حصے شائع کر دیئے تھے۔

پاکستان میں مطلق العنان آمریت کیلئے مذہب کے استعمال کی بنیاد اس ملک کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان نے 12/مارچ 1949ء کو دستور ساز اسمبلی سے قرارداد مقاصد منظور کر کے فراہم کی۔ اس قرارداد کی مخالفت میں مشرقی بنگال (مشرقی پاکستان) کے ہندو ارکان اسمبلی نے بڑی مدلّل اور زوردار تقریریں کیں لیکن وہ بے اثر ثابت ہوئیں۔ ایک رکن اسمبلی بھوپندر کمار دتہ کی تقریر کا یہ اقتباس بہت غور طلب ہے۔ اس نے کہا ''خدانخواستہ ایسا

بھی ہوسکتا ہے کہ کسی دن کوئی یوآن شی کائی ☆ یا بچہ سقہ جیسا سیاسی طالع آزما اپنی مرضی اور اختیار اس ریاست پر ٹھونس دے..... وہ ہماری ریاست کے عوام کے سامنے اپنے دعوے کی بنیاد اس قرار داد کی اس شق پر رکھے جس میں کہا گیا ہے کہ اللہ نے جمہور کی وساطت سے مملکت پاکستان کو اختیار حکمرانی نیابتاً عطا فرمایا ہے۔ اسے اس میں صرف ایک اور رشتہ جوڑنا ہوگا اور وہ یہ کہ مملکت پاکستان کی وساطت سے اختیار حکمرانی نیابتاً جمہور کو مل گیا ہے اور پھر وہ اعلان کردے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے پاکستان کا حکمران مقرر کیا ہے۔'' 5/جولائی 1977ء کو ضیاء الحق نے یہی کیا جس کی پیش گوئی دتہ نے 1949ء میں کردی تھی۔ ضیاء الحق نے قرار داد مقاصد کے انہی الفاظ کو اپنے اقتدار کے قیام اور دوام کے لئے استعمال کیا اور پھر 1985ء میں جب اس نے غیر جماعتی کٹھ پتلی اسمبلی کے انتخابات کرائے تو آئین میں آٹھویں ترمیم کر کے شق (A) 2 کے تحت اس قرارداد کو آئین کا باقاعدہ حصہ بنا دیا گیا۔ ترقی پسند حلقوں کو اس قرارداد کو آئین سے حذف کرنے کا مطالبہ کرنا چاہیے اور اس کی جگہ قائداعظم کی 11/اگست 47ء کی دستور ساز اسمبلی کی تقریر کو آئین کا دیباچہ بنانا چاہیے۔

پاکستان کی سول وملٹری اسٹیبلشمنٹ اور امریکی سامراج دونوں کو اسلام اور نظریہ پاکستان کے نعروں کی شروع ہی سے ضرورت پڑ گئی تھی۔ مارچ 1947ء میں امریکی صدر ٹرومین نے کمیونسٹ بلاک کی حصار بندی کے لئے مذہب اور تقریر کی آزادی کے نظریے Thuman Docrine کو پیش کیا اور پاکستان بہت جلد اس حصار بندی کا حصہ بن گیا۔ برطانیہ کے ایماء پر لیاقت علی خاں نے چوہدری خلیق الزماں کو مشرق وسطیٰ کے ممالک میں بھیجا اور اسلامی بلاک بنانے کی دعوت دی جس کا نام اسلامستان تجویز کیا گیا۔ اسی تجویز نے بعد میں CENTO معاہدے کی صورت اختیار کی۔ پاکستان ایک ایسے عالمی سامراجی دفاعی نظام کا حصہ بن گیا کہ کبھی یہاں سے سوویت یونین کی جاسوسی کے لئے U-2 طیارے اڑائے جاتے اور کبھی کوریا اور نہر سویز پر استعماری یلغار میں استعماری طاقتوں کا ساتھ دیا جاتا۔

داخلی طور پر پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کو اسلام اور نظریہ پاکستان کی شدید ضرورت

اس لئے پڑ گئی تھی کہ پاکستان میں شامل ہونے والی جن قومیتوں کی اسٹیبلشمنٹ میں نمائندگی نہ ہونے کے برابر تھی یعنی بنگالیوں، سندھیوں، پٹھانوں اور بلوچوں کو ان کے حقوق سے محروم رکھا جا سکے ۔وہ جب اپنے حقوق کیلئے آواز اٹھائیں تو انہیں اسلام اور نظریہ پاکستان کا مخالف قرار دے کر کچل دیا جائے۔ اسی طرح محنت کش طبقہ جب اپنے حقوق کی جدوجہد کرے تو اسے بھی اسلام اور نظریہ پاکستان کے نام پر دبا دیا جائے ۔ان حالات میں پاکستان میں اگر کوئی پتہ بھی ہلتا تھا تو اقتدار اور استعمار کے ایوانوں میں کھلبلی مچ جاتی تھی۔ 50ء اور 60ء کے عشرے میں ترقی پسندوں کی کسی سرگرمی کی معمولی سی بھنک بھی کان پڑتی تو اسٹیبلشمنٹ انتہائی اقدام کر گزرتی تھی۔ 1951ء میں روالپنڈی سازش کیس کے الزام میں میجر جنرل اکبر خان اور فیض صاحب سمیت کئی اہم شخصیتوں کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ جبکہ یہ محض ایک خیال کی حد تک چند دوستوں میں زیر بحث آیا تھا اور پھر اسے نا قابل عمل سمجھ کر رد کر دیا گیا تھا۔ بقول فیض

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت نا گوار گزری ہے

1954ء میں مشرقی پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی کی ٹریڈ یونین سرگرمیوں نے زور پکڑا تو اس پارٹی پر پہلے مشرقی پاکستان اور پھر پورے پاکستان میں پابندی لگا دی گئی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین بھی زیر زمین چلی گئی۔ تاہم بائیں بازو کی تنظیموں نے خفیہ سرگرمیا ں جاری رکھیں۔ انقلابیوں کی پکڑ دھکڑ جاری رہی ۔58ء سے 68ء تک ایوب خان کا دور اقتدار ترقی پسندوں کے لئے بڑا سخت دور تھا ۔اسی دور میں حسن ناصر کو لاہور کے قلعہ میں پھانسی دی گئی۔

یہ پس منظر اسلئے بتایا گیا ہے تا کہ آپ پاکستانی اسٹیبلشمنٹ اور حکمران طبقوں کی اس بے چینی کا اندازہ لگا سکیں جو 70ء کے انتخابات کے نتیجے میں ان کو در پیش ہوئی تھی۔ملک کے دونوں بازوؤں میں بائیں بازو کی جماعتیں یعنی عوامی لیگ، پیپلز پارٹی اور

عوامی نیشنل پارٹی کامیاب ہوئی تھیں ۔پاکستان کی تاریخ کے یہ واحد انتخابات تھے جن کو Fair اور شفاف قرار دیا جا سکتا ہے ۔یحیٰی خان کی اسٹیبلشمنٹ نے یہ انتخابات اسلئے Fair ہو جانے دیئے تھے کہ اس کے وزیر اطلاعات نوابزادہ شیر علی خاں نے یقین دلایا تھا کہ دائیں بازو کی جماعتیں اکثریت سے جیت جائیں گی۔ اسٹیبلشمنٹ نے یہ پہلا اور آخری دھوکہ کھایا ۔اس کے بعد ضیاء الحق نے ہمیشہ یہ کہا کہ انتخابات تب ہوں گے جب ''مثبت نتائج'' یقینی بنا لئے جائیں گے۔ 70ء کے انتخابات کے مثبت نہ ہونے پر تمام دائیں بازو کی جماعتوں ،اخبارات اور رسائل نے مطالبہ کر دیا کہ چونکہ اسلام اور نظریہ پاکستان کی مخالف جماعتیں انتخابات میں کامیاب ہوگئی ہیں اسلئے ان انتخابات کو کالعدم قرار دے دیا جائے اور ان جماعتوں پر پابندی لگا دی جائے۔ اسکے بعد کسی مناسب وقت پر صرف صالحین کی جماعتوں کو انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت دی جائے اوراس وقت تک یحیٰی خان انتظامیہ اقتدار پر قابض رہے بلکہ اسے تاحیات صدر بنے رہنے کی بھی تجویز دی گئی ۔مشرقی پاکستان میں اس مشورے پر عمل کیا گیا۔انتخابات اور عوامی لیگ کالعدم قرار دے دیے گئے ۔یحیٰی خان جو اس وقت تک دائیں بازو کا ہیرو اور اسلام اورنظریہ پاکستان کا مجاہد تھا، مشرقی پاکستان کے عوام پر فوج لے کر چڑھ دوڑا۔ملک ٹوٹ گیا۔ 16 ردسمبر سقوط ڈھاکہ۔ اگلے روز دائیں بازو نے یحیٰی خان کو زانی وشرابی قرار دے کر ملک ٹوٹنے کی تمام تر ذمہ داری اسکی عیاشی کے سر تھوپ دی۔

یحیٰی خان کی انتظامیہ ذولفقار علی بھٹو کو اقتدار منتقل کرنے یا اقتدار میں شامل کرنے کے بارے میں مخلص نہیں تھی ۔دسمبر کے پہلے ہفتہ میں جب جنگ شروع ہوئی تو بین الاقوامی سطح پر حمایت حاصل کرنے کے لئے یہ تاثر دینے کی خاطر کہ سیاسی حکومت تشکیل دے دی گئی ہے، ایک حکومت تشکیل دی گئی ۔دائیں بازو کی جماعت پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی کے صدر نورالامین جس نے واحد اپنی نشست جیتی تھی، کو وزیر اعظم اور بھٹو کو، جو کہ عوامی لیگ کالعدم قرار دیئے جانے کے بعد ایوان کی سب سے بڑی جماعت پیپلز پارٹی کا سربراہ تھا

اور اس کے پاس ایوان میں 88 نشستیں تھیں، ڈپٹی وزیراعظم اور وزیر خارجہ بنایا گیا۔ ایک نشست اور 88 نشستوں کے درمیان اقتدار کی اس بندر بانٹ سے صاف ظاہر تھا کہ یحییٰ خاں اقتدار کی منتقلی کے بارے میں کیا رویہ رکھتا تھا۔ یہ بندوبست چند دن بعد سقوط ڈھاکہ کے نتیجہ میں برقرار نہ رکھا جا سکا۔ جنرل گل حسن کی قیادت میں فوجی جرنیلوں نے مجبوری میں بھٹو کو اقتدار منتقل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسی گل حسن نے 73ء میں فوجی بغاوت کی کوشش بھی کی جو ناکام بنا دی گئی۔

بھٹو صاحب کا پانچ سالہ دور حکومت سول و فوجی اسٹیبلشمنٹ کیلئے مجبوری کا نام شکریہ والی بات تھی۔ ڈاکٹر مبشر حسن نے اپنی کتاب Mirage of power میں تفصیل سے بیان کیا ہے کہ اسٹیبلشمنٹ ان کے کاموں میں کیا کیا روڑے اٹکاتی تھی اور بھٹو صاحب خود کہتے تھے کہ ہم جو چاہتے ہیں وہ کر نہیں سکتے۔ بھٹو کی پالیسیوں پر تنقید اور ان سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور کیا جانا چاہیئے۔ 70ء کی بائیں بازو کی پیپلز پارٹی جس میں درمیانے اور نچلے طبقے کے کارکن اور دانشور زیادہ موثر تھے 77ء تک کارنر کیے جا چکے تھے اور جاگیرداروں اور وڈیروں کا غلبہ ہو چکا تھا اور مولوی کوثر نیازی کی رجعتی لائن بھی غالب ہو چکی تھی۔ مگر بھٹو اب بھی اسٹیبلشمنٹ اور امریکی سامراج کو قابل قبول نہیں تھا۔ اس کی چند وجوہات تھیں۔

داخلی وجوہات:

1۔ صنعتی یونٹوں، بنکوں، تعلیمی اداروں اور دیگر نجی اداروں کے قومیانے کی پالیسی جیسی تیسی بھی تھی، اس سے صنعتکاروں، تاجروں اور پرائیوٹ سیکٹر میں بھٹو کی شدید مخالفت تھی۔ بالخصوص پنجاب اور کراچی میں۔

2۔ پنجابی شونزم اور مہاجر شونزم کو ایک سندھی وڈیرے کا اقتدار قابل قبول نہیں تھا۔

3۔ مذہبی جماعتیں جو صنعتکاروں اور تاجروں کی مالی امداد پر پلتی تھیں اور ان کے مفادات کی ترجمان تھیں، نفاذ اسلام کے نعرے بلند کرتی ہوئی میدان میں نکل

پڑی تھیں۔

4۔ اسٹیبلشمنٹ کی اکثریت پنجاب اور کراچی کے درمیانے طبقہ سے تھی جو مذکورہ تینوں عوامل کے ساتھ برابر کی شریک تھی ۔ PNA ان تمام عوامل کا مجموعہ تھی اور اسے اسٹیبلشمنٹ کی اشیر باد حاصل تھی ۔

خارجی وجوہات :

امریکہ افغان جہاد شروع کرنے کی تیاری کر چکا تھا۔ عام تاثر یہ پایا جاتا ہے بلکہ غلط طور پر پھیلایا جاتا ہے کہ افغان جہاد سوویت یونین کے افغانستان پر حملے کے ردعمل میں شروع کیا گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ گلبدین حکمت یار 1974ء میں پاکستان آچکا تھا اور اس کی حزب اسلامی اور برہان الدین ربانی کی جمعیت اسلامی کے کیمپ افغانستان کے سرحدی علاقوں میں قائم ہو چکے تھے۔ انہیں برطانیہ اور امریکہ کی حمایت حاصل تھی۔ افغانستان کے نئے صدر داؤد کا جھکاؤ سوویت یونین کی طرف تھا اور اس نے ڈیورنڈ لائن اور پختونستان کے حوالے سے افغانستان کے پرانے دعوؤں کی تجدید شروع کر دی تھی۔ بھٹو صاحب نے صدر داؤد سے ملاقات کی تھی اور حالات کو سیاسی سطح پر حل کرنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ لیکن امریکہ کا دباؤ تھا کہ مذکورہ افغان مجاہدین کو تربیت اور اسلحہ سے لیس کیا جائے اور افغانستان میں مسلح بغاوت شروع کی جائے۔ اکا دکا واقعات ہونے شروع ہو بھی گئے تھے۔ ابھی افغانستان میں روسی فوج کشی یا وہاں کمیونسٹ انقلاب کا دور دور بھی نام نشان نہیں تھا۔ بھٹو صاحب کی ایک تاریخی تقریر ہے جو انہوں نے مئی 1977ء میں قومی اسمبلی میں کی تھی۔ اس میں انہوں نے امریکہ کے لیے ''سفید ہاتھی'' کا لفظ استعمال کیا تھا۔ انہوں نے 2 گھنٹے کی اس تقریر میں ایک ایک کر کے وہ تمام باتیں گنوائی تھیں جن کے لیے امریکہ ان پر دباؤ ڈال رہا تھا۔ مختصراً یہ ہیں:

1۔ افغانستان میں مسلح بغاوت کی سرپرستی

2۔ پاکستان کی ایٹمی پالیسی۔ نیوکلیئر پروگرام، فرانس سے ایٹمی ری پراسنگ پلانٹ کا

معاہدہ اور ایٹمی بجلی گھر۔ یاد رہے امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر فروری 1977ء میں بھٹو صاحب کو نیوکلیئر پروگرام کے حوالے سے دھمکی دے کر جا چکا تھا۔

3۔ ہندوستان سے تعلقات کی بہتری۔ تاکہ پاکستان مکمل توجہ مغربی سرحدوں (افغانستان) پر مرکوز کر سکے۔

بھٹو صاحب نے کچھ باتیں بین السطور اور کچھ کھل کر کیں۔ ان کا لب لباب یہ تھا کہ ہم سب کچھ کرنے کو تیار ہیں لیکن ہمیں ہر آڑے وقت میں امریکہ نے کیا دیا ہے۔ اس لیے اسے ''سفید ہاتھی'' کہا۔ تاہم انہوں نے کہا کہ ہم مذکورہ مسئلوں پر اپنی ترجیحات کے مطابق کام کریں گے۔

اس تقریر سے امریکہ پر واضح ہو گیا تھا کہ وہ اس خطے میں جس Great Game کی بساط بچھا رہا ہے اس میں بھٹو صاحب Fit نہیں ہوتے بلکہ وہ مزاحمت کر رہے ہیں۔ علاوہ ازیں آنے والے افغان جہاد کے لیے جس قسم کی جہادی سوچ اور جہادی کلچر کی پاکستان میں ضرورت تھی، بھٹو صاحب اس کے لیے بھی کوالیفائی نہیں کرتے تھے۔ ضرورت اس بات کی بھی تھی کہ بائیں بازو کی وہ قوتیں جو 67ء کی عوامی تحریک کے بعد سے گزشتہ 10 سال میں پاکستانی معاشرے میں خاصا اثر و رسوخ اختیار کر چکی تھیں باوجود اس کے کہ پیپلز پارٹی کی قیادت اپنی ابتدائی لائن سے بہت حد تک انحراف کر چکی تھی، ان بائیں بازو کی قوتوں کی مکمل بیخ کنی کی جائے۔ اس کام کے لیے بھی فوج کے آہنی شکنجہ کی ضرورت تھی۔

ادھر مقامی بایاں بازو اور بلوچستان و سرحد کی قومیتی جماعتیں بھی ناراض تھیں۔ بلوچستان میں آرمی ایکشن جاری تھا۔ وہ قوتیں جو بھٹو کی فطری اتحادی ہو سکتی تھیں اور جن کی مدد سے بھٹو اپنی مخالف قوتوں کا مقابلہ کر سکتا تھا، بھٹو ان سے الگ تھلگ Alienate ہو چکا تھا۔

ان اندرونی اور بیرونی عوامل کے نتیجے میں 5/جولائی 1977ء کو ضیاء الحق نے ''نحمدہ و نصلی علیٰ'' پڑھ کر اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ آئین، اسمبلیاں اور تمام سیاسی ادارے معطل کر دیئے گئے۔ پیپلز پارٹی اور بائیں بازو کے کارکنوں کی وسیع پیمانے پر گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ سیاسی کارکنوں، صحافیوں اور دانشوروں کا سمری ٹرائیل کر کے گرفتاری کے چند گھنٹوں

بعد کوڑے مار دیئے جاتے تھے۔ 4/اپریل 1979ء میں بھٹو کی پھانسی تک یہ تشدد انتہا درجے تک جاری رہا۔ ضیاء الحق نے بڑی مسرت سے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا کہ بھٹو کی پھانسی پر کسی نے آنسو نہیں بہائے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بھٹو کے دوست اور مخالف سب رنجیدہ تھے۔ یہ صرف بھٹو کی ذات کا قتل نہیں تھا۔ اس کے ساتھ 11 سالہ ضیاء دور میں جو کچھ قتل کیا گیا وہ تھا اظہار رائے، آزادئ فکر، تعلیم و تربیت، آزادئ نسواں، بنیادی انسانی حقوق بلکہ انسانیت ہی قتل کر کے رکھ دی گئی۔ سیاست، صحافت، فن و ادب، ڈرامہ اور تھیٹر پر بھانڈ قابض ہو گئے۔

لیکن انسانیت پر یقین رکھنے والے سیاست دان، دانشور، شاعر، ادیب اور فنکار اس صورت حال پر برابر مزاحمت کرتے رہے۔ مزاحمتی شعر و ادب، مزاحمتی ڈرامہ تھیٹر اور موسیقی ابھر کر سامنے آئے۔ بے شمار تخلیق کار، سیاسی کارکن اور دانشور جلاوطن ہو گئے یا جلاوطنی پر مجبور کر دیئے گئے۔ ان میں فیض صاحب بھی تھے۔ اپنے انتقال سے کچھ عرصہ پہلے واپس لوٹے اور 1983ء میں ایام علالت میں یہ اشعار کہے

پھول مسلے گئے فرش گلزار پر
رنگ چھڑکا گیا تختہ دار پر
بزم برپا کرے جس کو منظور ہو
دعوت رقص ، تلوار کی دھار پر
دعوت بیعت شہ پہ ملزم بنا
کوئی اقرار پر ، کوئی انکار پر

شذرات(Notes):

☆یو آن شی کائی چینی فوج کا جرنیل تھا جس نے 1912ء میں قینگ خاندان کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا تھا اور خود حکمران بن بیٹھا تھا۔ اس نے ڈاکٹر سن یات سن کو بھی اقتدار سے محروم رکھا جسے عوام نے صدر منتخب کیا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد ہی ڈاکٹر سن یات سن کی نیشنلسٹ حکومت قائم ہو سکی تھی۔

عالمی شہرت کے حامل صحافی و محقق زاہد چوہدری
اور شہرۂ آفاق و مستند محقق و دانشور حسن جعفر زیدی
کی جدید ترین اور سائنسی خطوط پر کی گئی بے لاگ اور مستند ترین تحقیق پر مبنی
پاکستان کی سیاسی تاریخ (12 جلدیں)

جلد 2,1 (پاکستان کیسے بنا؟)

پاکستان بننے کا عمل، مستند سرکاری دستاویزات و ماخذ پر مبنی نادر کتب

جلد 3: (مسئلہ کشمیر کا آغاز)

مسئلہ کشمیر اور پاک بھارت تنازعہ کے باہمی تعلق اور پاکستانی حکمرانوں کی موقع پرستی کی تفصیلات پر مبنی ایک اہم دستاویز۔

جلد 4: (پنجابی، مہاجر تضاد)

قائداعظم محمد علی جناح اور لیاقت علی خان کے درمیان اختلافات اور پنجابی مہاجر تضاد پر اکلوتی اور اچھوتی کتاب

جلد 5: (مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقاء)

پنجاب کے مسلمانوں کی سیاسی و سماجی جدوجہد، مسلمان جاگیرداروں کے دوغلے کردار اور علامہ اقبال کی سیاست کی تفصیل۔

جلد 6: (سندھ، مسئلہ خودمختاری کا آغاز)

سندھیوں کو ان کے جائز حقوق سے محروم رکھنے کی حکمت عملی اور نوزائیدہ سندھی درمیانہ طبقہ کی جدوجہد کی تاریخ۔

جلد 7: (بلوچستان، مسئلہ خودمختاری کا آغاز)

بلوچی عوام کی معاشی، سماجی اور سیاسی پس ماندگی، بلوچستان کو اس کے جائز حقوق سے محروم رکھنے کی حکومتی کوشش اور بلوچی عوام کی جدوجہد خودمختاری کی تاریخ

جلد 8: (پختون، مسئلہ خودمختاری کا آغاز)

افغانستان کا قیام، پاکستان اور افغانستان کے تعلقات اور صوبہ سرحد کی خودمختاری کی جدوجہد پر مستند دستاویز۔

جلد 9: (بنگالی مسلمانوں کا تحریکِ پاکستان میں کردار)

بنگال کے مسلمانوں کا قیام پاکستان میں ہراول دستہ کا کردار اور تحریک پاکستان کی مبادیات کو سمجھنے کے لیے ایک اہم کتاب۔

جلد 10: (مشرقی پاکستان کی تحریک علیحدگی کا آغاز)

بنگالی عوام کی جدوجہد خودمختاری کی ایسی داستان جس کے بغیر بنگلہ دیش کے قیام کو سمجھنا ممکن نہیں ہے۔

جلد 11: (پاکستان میں اسلامی انتہا پسندی کا آغاز)

مذہب کو کیسے اور کیوں استعمال کیا گیا؟ مذہب کے نام پر ہونے والی موجودہ خونریزی کو سمجھنے کے لیے ایک ضروری مطالعہ۔

جلد 12: (پاکستان امریکہ کا غلام کیسے بنا؟)

مذہب کے نام پر پاکستان کو اینگلو امریکی سامراج کی غلامی میں دھکیلنے کی تاریخ جس کے نتائج ہم آج تک بھگت رہے ہیں۔ اپنے موضوع پر شائع ہونے والی واحد کتاب۔

مسلمانوں کی سیاسی تاریخ (4 جلدیں)

جلد اوّل میں دورِ رسالت مآب ﷺ سے لے کر، خلافت راشدہ، جلد دوم میں عہد بنوامیّہ، جلد سوم اور جلد چہارم میں عہد بنوعباس میں پیش آنے والے واقعات، سازشوں اور دیگر عوامل کا غیر جانبدارانہ اور غیر متعصّبانہ احوال اور سائنسی تجزیہ۔

نیز پاکستان کیسے بنا؟ کی دونوں جلدیں CD پر بھی (-/150 روپے میں) دستیاب ہیں۔

براہِ راست ادارہ سے منگوائیں۔ کوئی ڈاک خرچ نہیں۔

(طلبا اور اساتذہ کے لیے خاص رعایت)

برائے رابطہ: ادارہ مطالعہ تاریخ

66۔ایچ۔2، واپڈا ٹاؤن۔ لاہور

فون: 042- 35224247, 35182835

فیکس: + 92 - 42 - 35183166